حالی اور ظفر علی خان ......ارتباطی مطالعہ

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

Abstract:

Maulana Altaf Hussain Hali (1837---1914) was not only a renowned poet and critic but he was a kind mentor as well. He trained his juniors to serve their Nation with zeal and zest. Maulana Zafar Ali Khan (1873---1956) was an admirer and follower of Maulana Hali in his literary pursuits. This article deals with their relations and discovers unfolded aspects of both great literary figures. Some rare letters of Maulana Hali and a poem in praise of Zafar Ali Khan are also presented here.

Keywords: Altaf Hussain Hali. Zafar Ali Khan, Hyderabad Deccan, Hali's Letters, Poetry. Deccan Review.

ہماری قومی تاریخ میں مسدس حالی کو جو مقام حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں مسدس کی تکمیل کے بعد حالی نے اس پر ایک ضمیمہ بھی ایزاد کیا تھا اس ضمیمے کے مضامین نہایت درجہ اہم ہیں۔ منجملہ دیگر مضامین کے حالی نے قومی ترقی کا ایک راز یہ بتایا ہے کہ جو ہر قابل کی قدر کی جائے جن میں کچھ ہنر دیکھو ان کا حوصلہ بڑھاؤ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ ایسے افراد کا دل اور حوصلہ بڑھائے انھیں سر آنکھوں پہ بٹھائے اور ایسے افرادِ قوم طبقۂ نوجوانان ہی میں ہو سکتے ہیں جن کے سامنے امکانات کا ایک جہان آباد ہوتا ہے۔ اگر قومی خدمت کے کسی کام کی انجام دہی پر انھیں حوصلہ افزائی اور داد ملے تو ان میں خدمت قومی کا مزید جذبہ پیدا ہوگا اور رفتہ رفتہ قوم میں ایسے افراد کی تعداد بڑھتی جائے گی جو ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دینا جانتے ہوں گے نہ صرف جانتے ہوں گے بلکہ اس ضمن میں عملی نمونہ بن کر دکھائیں گے۔اور بہ الفاظِ حالی یوں معاشرے میں ایک ایسی جماعت تشکیل پائے گی جو گھرانوں میں خیر و برکت اور قوم کی شان و شوکت بڑھانے کا باعث بن جائے گی۔ اس مبحث میں حالی نے اپنے انداز خاص کے مطابق یونان کی مثال دی ہے جسے علم وفن کی تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ حالی سوال اٹھاتے ہیں کہ اہلِ یونان نے مختلف علوم وفنون میں جو ترقی کی اس کا راز دریافت کرنا چاہیے اس کا پہلا سبب تو افرادِ قوم کی زندگیوں میں بلند مقاصد کی موجودگی تھی، چھوٹا بڑا سب زندگی کے بلند مقاصد کے جویا تھے، اس کے علاوہ انھوں نے فن سے محبت سیکھ

لی تھی وطن کی محبت اس پر مستزاد تھی، ایسی صفات ہی نے ایک ایسے تمدن کی تشکیل کی جس کے ثمرات سے آج بھی صرف نظر نہیں کیا جاتا۔

یونانی معاشرے میں جو لوگ علم وحکمت کی دنیا میں کوئی کارنامہ انجام دیتے تھے معاشرہ انھیں سر آنکھوں بٹھاتا تھا جیتے جی اگر وطن ان پر قربان ہوتا تھا تو پس ازمرگ انھیں دیوتاؤں کی طرح پوجا جاتا تھا۔یہی وہ صفات تھیں جن کی بنا پر ایک جزیرے نے یونان کا رتبہ پالیا اس لیے آج بھی اگر ملک وسلطنت کی وقعت مطلوب ہو، گھرانے کی عزت درکار ہو، عقائد وافکار کی ذلت گوارانہ ہو، اپنی نسلوں کے مستقبل سے دلچسپی ہو تو پھر قومی مسائل میں دلچسپی لینا ہوگی اور قومی خدمت کی سمت مائل ہونے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگی:

کرو قدر ان کی ہنر جن میں پاؤ ترقی کی اور ان کو رغبت دلاؤ
دل اور حوصلے ان کے مل کر بڑھاؤ ستوں اس کھنڈر گھر کے ایسے بناؤ
کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے
بٹھائیں انھیں سر پہ اپنے پرائے(۱)

سچے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کے خیالات کا اثر اس کی زندگی پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ہماری ادبی تاریخ میں شاید حالی اس کی بہترین مثال ہے، جو دوسروں کے لیے سوچنا جانتا ہے ان کی خوشیوں کے لیے کوشاں اور دوسروں کی زندگیوں سے غموں کو دور کرنے کا خواہش مند ہے۔خنجر کسی پہ چلے دل حالی کا تڑپتا ہے۔مولوی عبدالحق نے حالی کے خاکے میں ان کی انسان دوستی کے جو واقعات لکھے ہیں انھیں پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حالی اپنی زندگی میں ہمدردی sympathy سے آگے بڑھ کر ہم احساسی Empathy کے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔

خوردوں کی حوصلہ افزائی بھی حالی کی انھی صفات میں سے ہے جس کی مثال آج شاید چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔اس تحریر میں حالی کی شخصیت کے اسی گوشے کا تذکرہ مقصود ہے جس میں وہ اپنے خوردوں کو غیر معمولی عزت وتکریم سے نوازتے ہیں ایسے خورد جن سے انھیں قومی خدمت کے کاموں کی توقع ہے اور جن کے ہاں خدمتِ قوم کا جذبہ دکھائی دے رہا ہے۔حالی انھیں اپنے بہترین لفظوں کا خراج پیش کرتے ہیں اور صرف الفاظ کا تحفہ ہی نہیں بھیجتے خود اِن کی خدمت میں بہ نفس نفیس یہ خراج تحسین پیش کرنے کے آرزومند دکھائی دیتے ہیں۔

حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء کی ہے جب کہ ظفر علی خان ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔اس حساب سے ظفر علی خان، حالی سے کم وبیش چھتیس برس چھوٹے تھے یہ دو افراد کی عمر میں ایک نسل سے زیادہ کا فرق ہے اور پھر علمی مقام و مرتبے میں ظاہر ہے کہ ظفر علی خان کی حیثیت حالی کے ایک خوشہ چین کی سی تھی لیکن اس کے باوصف بیسویں صدی کے آغاز میں جب ظفر علی خان کی جانب سے قومی خدمت کے کاموں میں دلچسپی کا اظہار ہوا اور ان کے قلم سے ایسی تحریریں نکلنے لگیں جن میں ان کا جذبہ قومی کروٹیں لیتا دکھائی دیتا تھا تو حالی ان کی جانب متوجہ ہوگئے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حالی نے ظفر علی خان اور ان جیسے دوسرے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی، ان کی تحریروں کو دیکھنا، ان

پررائے دینا، کمی اور کمزوری پر ٹوکنا اور اصلاحِ احوال کے لیے تجاویز دینے کو اپنا ایک قومی و ملی فرض سمجھا۔ حالی کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اوصاف حالی کی شخصیت کے بنیادی عناصر بن کر ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ظفرعلی خان جب حیدرآباد آئے تو وہ ایک نئے گریجوایٹ تھے اور حالی اس وقت ہندوستان بھر میں ایک بزرگ اور نہایت سینئر شاعر، مصنف اور دانشور کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

ظفرعلی خان سے حالی کے تعلق پر مختلف جہات سے بات کی جاسکتی ہے مثلاً ظفرعلی خان کا حالی سے ابتدائی تعارف اورحالی کے ساتھ ان کا نیازمندانہ رویہ،حالی سے اثر پذیری اور نثر و نظم میں اس کا اظہار، تلمذ کا سوال، مکاتیب حالی میں ظفرعلی خان کا ذکر،کلام حالی پرظفرعلی خان کا تبصرہ،مکاتیب حالی بنام ظفرعلی خان ،دوسروں کے نام حالی کے خطوط میں ظفرعلی خان کا ذکر ، حالی اور دکن ریویو،دکن ریویومیں کلامِ حالی،دکن ریویو کے اسلام نمبر پر حالی کا تبصرہ، ظفرعلی خان کا اعترافِ عظمت،ظفرعلی خان کو حالی کا خراجِ تحسین،ظفرعلی خان کے زمیندار میں ذکر حالی وغیرہ۔آمدہ سطور میں انھی پہلوؤں پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ابتدائی تعارف:

ایک علیگ ہونے کے ناتے حالی کا نام ظفرعلی خان کے لیے کسی طور بھی اجنبی نہیں رہا۔ایک نام ور قومی شاعر ہونے کے علاوہ سرسید اور علی گڑھ سے ان کا تعلق تعارف کی اساس بنا ہوگا۔جس زمانے میں ظفرعلی خان، علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے اس زمانے میں حالی، علی گڑھ آتے تھے اور یہاں قیام فرما ہوا کرتے تھے۔شبلی سے تو ظفرعلی خان کی ملاقات مسلسل تھی کہ وہ شبلی کے تلامذہ میں شامل تھے اور یوں ان کی کلاس میں حاضر ہونا لازم تھا لیکن اس زمانے میں حالی کے ساتھ ان کی ملاقات کا کوئی حال البتہ ہمارے علم میں نہیں۔ایک حوالہ ان کے والد محترم سے سرسید اور حالی کے تعارف کا ضرور ملتا ہے اور اس کا ماخذ خود ظفرعلی خان کی ایک تحریر ہے جس میں انھوں نے اپنے والد مولوی سراج الدین احمد مرحوم کی شخصیت سے متعارف کرواتے ہوئے بتایا ہے کہ جس زمانے میں سرسید اور نواب محسن الملک کے درمیان استجابت دعا کے مسئلے پر بحث ہورہی تھی اس زمانے میں ان کے والد مولوی سراج الدین احمد مرحوم نے بھی اس سلسلہ بحث میں ایک مضمون لکھا تھا جو مولانا حالی کی نگاہ سے بھی گزرا تھا اور جسے مولانا حالی نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ظفرعلی خان کا بیان ہے کہ ''چونکہ فطری مناسبت کے تقاضے دبانے سے کبھی دب نہیں سکتے لہٰذا مرحوم کی طبیعت کا لٹریری رنگ اپنی جھلک کسی نہ کسی طرح دکھاتا رہا چنانچہ جس زمانے میں نواب محسن الملک مرحوم اور سرسید علیہ الرحمہ کے درمیان استجابتِ دعا کے متعلق دلچسپ مکاتبت کا سلسلہ جاری تھا کہ مرحوم نے ابھی ایک مضمون استجابت کے موضوع پر اس خوبی کے ساتھ تحریر فرمایا جسے سرسید مرحوم نے بطور لیڈر تہذیب الاخلاق میں چھپوایا اور مولانا حالی اسے پڑھ کر سر دھنتے رہے'' (۲)

سرسید کے قریب ترین دوست اور تہذیب الاخلاق کے معاون نواب محسن الملک کے ساتھ ظفرعلی خان کا تعلق بہت قریبی رہا بلکہ بی اے کرنے کے بعد وہ ان کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوگئے اور انھی کے ایما سے

انھوں نے A History of the Conflict between Religion and Science کا ترجمہ معرکہ مذہب وسائنس کے نام سے کیا اور اس کا انتساب نواب صاحب کے نام کرتے ہوئے ان کے فیض صحبت کا اس طرح اعتراف کیا:

> ''عالی جناب نواب محسن الملک مولوی سیدمہدی علی خان صاحب مرحوم و مغفور جن کا نام مسلمانان ہند کی علمی تاریخ میں آب زر سے لکھا جاچکا ہے سب سے پہلے شخص تھے جن کی تحریک پر میں نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا تھا اس لیے میں اس کتاب کی جو اب نظر ثانی کے بعد حواشی کے ساتھ مکمل ہوکر شائع ہوتی ہے عالی جناب ممدوح کی پاک یاد کے ساتھ نسبت دینے کی عزت حاصل کرتا ہوں.....ظفرعلی خان''(۳)

محسن الملک اور حالی میں بھی قریبی ربط ضبط تھا۔سرسید تحریک کے ایسے سربرآوردہ راہ نماؤں کے ساتھ قریبی تعلق کے باوصف مولانا حالی کے ساتھ ان کے روابط کا علم نہیں ہوتا،مولانا حالی کے ساتھ ان کے ربط ضبط کا حال ان کے حیدرآباددکن جانے کے بعد کھلتا ہے جہاں وہ پہلے نظام کی فوج سے منسلک ہوئے ،دارالترجمہ سے ان کا تعلق رہا،لیجسلیٹوکونسل کے رجسٹراراور اسسٹنٹ ہوم سیکریٹری کے طور پرخدمات انجام دیں اور بالآخر سازش کے الزام میں خارج البلد کردیے گئے ۔ حیدرآباد قیام کے زمانے میں انھوں نے جنوری ۱۹۰۴ء میں ایک علمی وادبی رسالہ دکن ریویو کے نام سے جاری کیا۔جب وہ خارج البلد ہوکر پنجاب اٹھ آئے تو اس کا نام پنجاب ریویو کردیا گیا اس کے ایک شمارے میں لکھتے ہیں :

> ''ہم لوگوں کے لیے جن کی نگاہیں نئی روشنی کی خوگر ہوچلی ہیں اس سے زیادہ فخر،اس سے زیادہ نازش کا مقام کیا ہوسکتا ہے کہ ہم نے سیداحمد جیسے مجددوقت کا دور دیکھا ہے۔محسن الملک کی جادو بیانیوں کے موتی جیب و داماں میں بھرے ہیں۔ داغ جیسے قادرالکلام شاعر کے فیض صحبت سے استفادہ کیا ہے۔ شبلی جیسے وحیدالعصر ویکتائے زمن کے خرمن فیوض سے خوشہ چینی کررہے ہیں اور حالی کی عدیم النظیر سخن وری وسخن سنجی سے مذاقِ سلیم کو بہرہ اندوز بنارہے ہیں''(۴)

خاندانی تربیت اور نیازمندی:

ظفرعلی خان ایک خالص مشرقی شخصیت کے مالک تھے ۔ ہنداسلامی تہذیب کے عناصر نے ان کے اخلاق و کردار کی تشکیل کی تھی ۔ قیام حیدرآباد کے زمانے میں وہ جہاں سرکار کے ایک اچھے عہدیدار کی حیثیت رکھتے تھے وہاں وہ ایک ایسے معروف ادیب کی حیثیت بھی اختیار کرچکے تھے جس کا رسالہ ملک کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بناچکا تھا۔حالی کے ساتھ ان کے تعلق کی ایک جہت یہ بھی تھی کہ حالی دکن ریویو کے لکھنے والوں میں شامل تھے۔ جیسا کہ خود ظفرعلی خان نے دکن ریویو کے ایک شمارے میں اپنے لکھنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مولانا حالی کا بھی تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں :''یورپ وامریکہ میں مضامین نگار بے معاوضہ لیے کچھ نہیں لکھتے ہمارے

ملک میں ایسے لوگ جو مضمون لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی ایسا کہ دکن ریویو میں اندراج کے قابل ہو، اوّل تو ہیں ہی گنتی کے اور دوسرے انھیں صلہ کی پروانہیں، شکر ہے کہ جن اصحاب نے ہمارے لیے مضامین لکھنے کی زحمت گوارافرمائی وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ہم اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں اور ان کی توجہات کے شکرگزار۔ اصحابِ ذیل کی عنایات کا سلسلہ اگراسی طرح قایم رہا تو ترقی کا کوئی درجہ نہیں جو دکن ریویو طے نہ کر سکے''(۵)

اس کے بعد جو نام دیے گئے ہیں ان میں چوتھے نمبر پر ''علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ''اور پانچویں نمبر پر ''شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پت'' کے نام بھی درج ہیں ۔(۶)

یہ وہ زمانہ ہے کہ جب حیدرآباددکن میں علم وادب کی شمع فروزاں تھی اور ہندوستان سے چن چن کر اہل علم و ادب کو وہاں جمع کرلیا گیا تھا اور ظفرعلی خان جیسے نو جوانوں کو اپنی شخصیت سازی کے لیے داغ، شبلی اور حالی کی صحبت میسر تھی ۔ مولوی عبدالحق نے اسی زمانے میں حالی اور ظفرعلی خان کی ایک ملاقات کی منظرکشی کی ہے آیئے اس منظر میں ظفرعلی خان کی شخصیت کی تصویر دیکھیے :

> ''قیام حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفرعلی خان، مولانا سے ملنے آئے اس زمانے میں وہ دکن ریویو نکالتے تھے کچھ عرصے پہلے اس رسالے میں ایک دومضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔مولانا نے اس کے متعلق ظفرعلی خان صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے ۔مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے''(۷)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ظفرعلی خان نے شبلی کی کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے شوخ چشمی کا مظاہرہ کیا ہمیں اب تک ایسا کوئی تبصرہ نہیں ملا ۔ویسے بھی ظفرعلی خان شبلی کے بارے میں نہایت درجہ بلند رائے رکھتے تھے ۔شبلی ان کے باقاعدہ استاد تھے اور وہ حق استادی استعمال کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ بھی کر سکتے تھے ۔شبلی کے باب میں شوخ چشمی کے برعکس موازنہ انیس و دبیر پرظفرعلی خان کا ریویوموجود ہے جس میں وہ اپنے استاد کے لیے سراپاعقیدت ہیں ۔جب ایک صاحب نے مولانا شبلی نعمانی کی کتاب موازنہ انیس ودبیر کے جواب میں ردالموازنہ شائع کیا تو ظفرعلی خان نے اس پر گرفت کی۔ ردالموازنہ خوش ذوقی کا مظہر نہیں تھا ظفرعلی خان نے اس بدذوقی کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

> ''یہ کتاب مجموعہ ہے ان بازاری گالیوں، سوقیانہ پھبتیوں کا جولکھنو کے نوابی دور نے اس برگشتہ بخت شہر کے اراذل وانفار کے ترکے میں چھوڑے ہیں اور نتیجہ ہے ایک ایسے شخص کے قلم کا جو مخالف سے معقولیت کے ساتھ عہدہ برآ نہ ہوکر گالیوں پر اتر آتا ہے اور اس پر دوچار فحش

آوازے کس کر اپنے ہم مشربوں اور ہم چشموں میں اپنا اعتبار قائم کرکھنا چاہتا ہے''

معترض کو صرف شبلی کی آرا ہی پر نہیں بلکہ ان کے نام پر بھی اعتراض تھا اس کا جواب دیتے ہوئے ظفر علی خان کا شوخ قلم، استاد کی حمایت پر یوں کمر بستہ ہوتا ہے:

''جس طرح انھوں نے نعمان کا وزن شعبان بتایا ہے ہم بھی بلحاظ اس نسبت وعقیدت کے جو انھیں مرزا دبیر سے ہے دُبیری بروزن نُصیری کا گرما گرم فقرہ ان پر چست کرکے سمجھ لیں کہ ہم تنقید کے حق سے عہدہ برآ ہوگئے لیکن ثقاہت مانع آتی ہے کہ ہم اس قسم کے عامیانہ استدلال سے کام لیں''[۸]

ہوسکتا ہے کہ مولانا حالی کو اسی تحریر کا لہجہ ناگوار گزرا ہو بلکہ اس بات کا خاصا امکان ہے۔ دوسری جانب یہ بات قابل توجہ ہے کہ مولانا شبلی کی حمایت میں اتنے شدید جذبات رکھنے والا قلم ان کے خلاف مضمون کیسے لکھ سکتا ہے یا پھر ہوسکتا ہے کہ دکن ریویو ہی میں کسی اور نے شبلی کی کسی کتاب کے بارے میں وہ مضمون لکھا ہو جس کا گمان مولوی عبدالحق صاحب کی تحریر سے ظفر علی خان کی طرف ہو رہا ہے مثلاً دکن ریویو میں'' عربی شاعری اور مثنوی'' کے موضوع پر محمد عبدالباسط کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جس میں مصنف نے مولانا کی اس رائے سے اختلاف کیا تھا کہ عربی میں مثنوی کا وجود مفقود ہے۔[۹]

بہ حیثیت مدیر ظفر علی خان کسی ایسی تحریر کی اشاعت پر بھی نادم ہوسکتے تھے جس میں شائستگی کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو لیکن جہاں تک ہم نے دیکھا اس مضمون کا لہجہ مناسب ہے۔ مولانا شبلی سے ظفر علی خان کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ شبلی نے جن تاریخی شخصیات کی مدح کی ہے وہ ان کی مخالفت بھی گوارا نہیں کرتے کجا وہ خود شبلی کے خلاف کچھ لکھیں۔ مثال کے طور پر زمانہ اور مخزن میں اورنگزیب عالمگیر کی نسبت شبلی کی آرا پر تنقید شائع ہوئی تو ظفر علی خان نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور مارچ اپریل ۱۹۰۸ء کے اداریے میں استاد محترم کی آرا کی وکالت کی[۱۰] تاہم پس منظر کی اس بحث سے قطع نظر، ظفر علی خان کی شخصیت کی جو تصویر مولوی عبدالحق صاحب نے پیش کی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے اور اسی سے حالی کے حضور ان کی نیازمندی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حالی سے اثر پذیری:

ظفر علی خان نے ''حالی کی عدیم النظیر سخن وری و سخن سنجی سے مذاق سلیم کو بہرہ اندوز بنانے'' کا جو اعتراف کیا ہے وہ محض سخن وری و سخن سنجی تک محدود نہیں بلکہ اس کی حدود اس سے کہیں آگے تک دکھائی دیتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل و دماغ میں حالی ایک مثال کے طور پر ہمیشہ موجود رہے۔ وہ اپنے پیغام میں حالی ہی کی خوشبو پاتے تھے بالکل اسی طرح جیسے اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں کلام حالی سناتے ہوئے ''میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا+ نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی'' کا اعلان واظہار کیا تھا[۱۱] یا جیسے اس سے بھی بڑھ کر سرسید کے فرزند نے ان سے کہا تھا کہ اگر اللہ نے کسی انسان کو سجدہ کرنے کی اجازت دی ہوتی تو میں حالی کو سجدہ

کرتا[۱۲] ظفرعلی خان بھی اپنے پیغام کے پس منظر کے طور پر پیام حالی کا حوالہ دیتے ہیں اور لاہور کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے جب ان کی گفتگو تعلیم کے دائرے میں داخل ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں:

''مسلمانوں کو زمانہ کا پیغام حالی مرحوم نے ان الفاظ میں پہنچایا تھا

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو بتا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام ان کا مٹادوں گا [۱۳]

ظفرعلی خان کی افسانوی تحریروں میں ایک ڈراما نازلی بیگم یا نازلی بیگم کا فیصلہ (یہ ڈرامہ ان دونوں عنوانات کے تحت شائع ہوا ہے) بھی ہے اس ڈرامے میں بھی وہ مولانا حالی کو یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نازلی بیگم ناز ونعم میں پلی ہوئی ایک دوشیزہ ہے جو عالم رویا میں اپنے ایک ایسے چاہنے والے سے شادی کر لیتی ہے جو انشاپرداز اور کوکب صبح نامی اخبار کا ایڈیٹر ہے لیکن اخبار کی سقیم مالی حالت اور ضمانت ضبطی کے ہاتھوں اس کے گھر کا چولھا بھی بخوبی روشن نہیں ہوتا۔ نازلی بیگم فلاکت زدہ خاتون بن کر رہ جاتی ہے اور ایسے میں جب اس کا ادیب وشاعر شوہر اپنے حالات بہتر بنانے کے لیے کسی کتاب کا ترجمہ کرنے اور ناول لکھنے کا عزم کرتا ہے تو نازلی بیگم اسے کہتی ہے ''تم ہمیشہ سے خیالی پلاؤ پکانے کے عادی تھے کتابیں بیچ کر اگر نفع حاصل کرنا چاہو گے تو رہا سہا اثاث البیت بھی نیلام ہو جائے گا تم کس خیال میں ہو۔ مولوی شبلی اور خواجہ حالی جیسے مصنفوں تک کی کتابیں تو بکتی ہی نہیں تمھاری کتابوں کو کون پوچھے گا......''[۱۴] نازلی بیگم کے ان خیالات کے پس پردہ ظفرعلی خان کے ذہن میں مولانا شبلی اور خواجہ حالی کی مصنفانہ عظمت بولتی سنائی دے رہی ہے۔ یوں تو اس سارے ڈرامے میں ہمیں مصنف کی سرگزشت کے عناصر کارفرما دکھائی دیتے ہیں (ہیرو کا ادیب وشاعر ہونا اخبار کوکب صبح کی ادارت، کوکب صبح ظفرعلی خان کے ستارۂ صبح سے کتنا قریب ہے اور پھر اخبار کی ضمانت کی ضبطی جو ظفرعلی خان کے اخبار زمیندار کی تو گویا پہچان ہی بن گئی تھی، انڈین پریس ایکٹ کا ذکر، زمیندار جس کا نشانہ بنا اور جس کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے ظفرعلی خان انگلستان تک گئے اور انھوں نے اس کے خلاف ایک انگریزی کتابچہ بھی لکھا) اس مقام پر ابنائے وطن کی ناقدری، بے ذوقی اور علم و ادب سے دوری کے جو احساسات مصنف کے باطن میں موجود تھے، نازلی بیگم کی زبان سے ادا ہونے لگتے ہیں۔ یہ بیسویں صدی کے آغاز کے ہندوستان ہی کی نہیں دنیا کے ترقی پذیر معاشروں کی عام صورت حال ہے، جسے آپ اپنے آج کے سماج پر بھی منطبق کر سکتے ہیں۔ جب نازلی بیگم مالی حالات کی بہتری کے لیے اپنے شوہر اور کوکب صبح کے ایڈیٹر محمد یوسف کی ناول نگاری اور ترجمہ نگاری کی تجویز کو رد کرتی ہے تو اس کا ادیب وشاعر مگر مفلوک الحال شوہر اس سے پوچھتا ہے کہ ''پھر کیا کروں؟ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا رہوں......'' اس پر نازلی بیگم عمومی معاشرتی رویوں کو اس طرح نشانہ طنز بناتی ہے:

'' بھانڈ بنو نقلیں کرو، بندر نچاؤ سرکار رس اور در بار نشین لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاؤ، جھوٹ بولو، خوشامد کرو، اس قسم کی ہر بات کرو لیکن خدا کے لیے مضمون نگاری یا تصنیف و تالیف کو ذریعہ

معاش بنانے کے خبط سے باز آجاؤ"[۱۵]

چھٹی صدی ہجری کا فارسی شاعر، جسے مولانا جامی نے تین "پیمبران سخن" میں شمار کیا ہے، انوری، یہی بات برنگ دگر پہلے کہہ چکا تھا:

ایخواجہ مکن تابہ توانی طلب علم
کاندر طلب راتب ہرروزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی [۱۶]

بہ ہر حال نازلی بیگم کا قصہ سنانے سے مولانا حالی اور ان کی تصانیف کی عظمت کا اظہار مقصود تھا جو ظفر علی خان کے قلب و ذہن میں جاگزیں تھی۔

مولانا حالی کی عظمت کا اعتراف، ظفر علی خان کی نثر یا تقریر تک محدود نہیں۔ انھوں نے شعر میں بھی حالی سے اثر پذیری کا اعتراف کیا ہے اور کیوں نہ کرتے ان کے لیے حالی کی اثر پذیری ایک اعزاز کی حیثیت رکھتی تھی۔ حالی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ظفر علی خان پر حالی کے اثرات کتنے دیرپا تھے اس بات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ۶ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو کہی گئی ایک نظم میں بڑے افتخار سے کہا ؎

مرے اشعارِ جاں پرور ہیں اک گلشن معانی کا
جو بو ان میں ہے حالی کی تو رنگ ان میں حزیں کا ہے [۱۷]

جہاں تک حالی کی بو کا تعلق ہے تو بات قابل فہم ہے کہ ظفر علی خان کا کلام، پیامِ حالی ہی کی توسیع ہے لیکن رنگِ حزیں کا دعویٰ محل نظر ہے۔ شیخ علی حزیں لاہیجی/ اصفہانی (۱۱۰۳ھ/ ۱۶۹۲ء......۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶ء) تو غزل کے ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں جذبے کی باریک پرتیں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ظفر علی خان کے مضامین کا لحاظ رکھتے ہوئے حبسیہ شاعری ہی کو لیں تو اس میں ان کی مشہور غزل کا یہ شعر ہی دونو شاعروں کا فرق واضح کر دیتا ہے ؎

ای وای بر اسیری کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد، صیاد رفتہ باشد[۱۸]

اس سبک اور نرم طرز بیان کو ظفر علی خان کے اسلوب کی تندی و تیزی سے کوئی نسبت نہیں۔ البتہ حیاتِ حزیں کے بعض پہلوؤں کو حیاتِ ظفر علی خان سے نسبت دی جا سکتی ہے۔ ظفر علی خان کے مزاج کی سی تندی و تیزی، حزیں کے مزاج میں بھی تھی مجلسی زندگی میں ان کی برہنہ گفتاری ان کے لیے مسائل پیدا کرنے کا باعث بنی جیسا کہ انھوں نے ایران سے ہندوستان آنے کے بعد یہاں کے فارسی گو شعرا کو نشانۂ تنقید بنا کر اپنے لیے مشکلات پیدا کیں۔ والہ داغستانی کہتا ہے کہ میں نے حزیں کو اہل ہند کی ہجو سے منع کیا لیکن وہ نہ مانا "من او را پند ہا دادم کہ از ہجو و بدگوئیِ مردم ہند صرف نظر کند واو نپذیرفت"[۱۹] نتیجہ یہ کہ وہ اپنے برسوں پر پھیلے ہوئے قیامِ ہندوستان میں یہاں والوں کی کڑی تنقید کا نشانہ بنا رہا اور اس کے تعاقب میں آرزو نے تنبیہہ الغافلین جیسی کتاب تصنیف کر ڈالی۔ آخر میں خود

حزیں نے اپنے قیام ہندوستان کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا: ''ناچار برخی ازقبائح و فضائح احوال و اوصاف این دیارِکدورت آثار شنعت اطوار نمایش خواہدگرفت و برکلک وصفحہ افسوس است۔ھمان بہترکہ ناظرین چنانکہ نگارش یافت، بدایت ورودمرا بہ این کشورنہایت زندگانی تصورنماید.....'' (۲۰) درآنحالیکہ قیام ہندستان میں مجموعی طور پر اس کے احوال برے نہیں رہے (۲۱) لیکن اس سب کچھ کو اس کے رنگ سخن سے نسبت نہیں۔ شاعری میں تو ان کی زبان شیریں، الفاظ سبک اور تراکیب فکرانگیز ہیں۔ چند اشعار دیکھیے :

دارم زداغِ دل چمنی در کنارِ خویش
در زیرِ بال میگزرانم بہارِ خویش (۲۲)

....

صافی دلان ندانند آئینِ پردہ پوشی
آئینہ زشت و زیبا ناچار می نماید (۲۳)

....

دل گواہست کہ درپردہ دل آرائی ہست
ہستیِ قطرہ دلیل است کہ دریائی ہست (۲۴)

تاہم یہ شاعری کی دنیا ہے جہاں شاعر کو تعلی کی سہولت بھی حاصل ہوتی ہے اور ظفرعلی خان کی شاعرانہ تعلیوں کے کیا کہنے۔ بہ قول خود جب وہ غزل خوانی پر آجائیں تو پھر وہی خواجوی وقت ہیں جو زلفِ عنبر بار سے کژدم بکھیر اور اژدر نکال سکتے ہیں۔ وہ جب تعلی پر آتے ہیں تو دنیائے شعر کے پیمبرانِ سخن کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور برملا کہتے ہیں۔

سخنوری میں نظیری نہیں ہے میری نظیر
مرے مقابلہ میں آج انوری کیا ہے (۲۵)

نظیری (م:۱۰۲۳ھ) کے بارے میں جلال اسیر نے کہا ہے کہ ''ہم چشمی نظیری حد بشر نباشد'' اور جس کے حضور، غالب جیسے انا پرست نے'' جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب+خطانمودہ ام وچشم آفرین دارم'' (۲۶) جیسا بے مثل خراج تحسین پیش کیا۔ جوش وخروش کی ان کیفیتوں سے ماورا ہے ظفرعلی خان کی شاعری جن سے بھری پڑی ہے۔ نظیری کے ہاں تو محبت کی لطیف کیفیات، راز ونیاز کے جلوے، زندگی کی سفاکی کے احساس سے جنم لینے والے باریک فلسفیانہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ یوں تو اس کے دیوان کے اوراق جابجا، جاابجاست کا نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن بہ طورِ خاص مندرجہ ذیل غزلیات ملاحظہ فرمائی جائیں تو اس کے رنگ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :

بزیرِ ہربن مو چشمِ روشنی ست مرا
بروشنایِ ہر ذرّہ روزنی ست مرا (۲۷)

....

ماحالِ خویش بی سر وبی پا نوشتہ ایم
روزِ فراق را شبِ یلدا نوشتہ ایم[(۲۸)]

....

نیست با خشک و ترِ بیشہء من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دارکنم[(۲۹)]

....

گریزد ازصفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسی کہ کشتہ نشد از قبیلہء ما نیست[(۳۰)]

....

وہ ایسا سخن ور ہے کہ ملک جمشید کے بدلے اقبال جیسا شاعرجس کاایک مصرعہ دینے پر راضی نہیں[(۳۱)] اورتوازن و اعتدال جس کی شاعری کے بنیادی اوصاف ہیں۔جس کی رفعتِ مقام کا عالم صائب اصفہانی جیسے استاد کے خیال میں یہ ہے کہ وہاں عرفی کے بھی پر جلتے ہیں :

صائب چہ خیال است شود ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نرسانید سخن را[(۳۲)]

دوسری جہت سے دیکھاجائے تو نظیری کے ہاں بادشاہوں ہی نہیں عام امیروں وزیروں کی قصیدہ گوئی کامیلان موجود تھااور اس میں وہ مبالغہ کرتے ہوئے بادشاہ کے خط کوقرآن شریف جیسی تعظیم دینے پربھی آمادہ ہوجاتا ہے[(۳۳)] جب کہ ظفرعلی خان کا مزاج سراپابغاوت ہے اور وہ تو سر مائیکل اوڈوائر کےلفظوں میں آتش بجاں تھے۔[(۳۴)] وہ ایسی بھٹئی کہاں کر سکتے تھے۔یہی حال انوری کا ہے ۔انوری اورظفرعلی خان کے حدودِشعربھی مختلف ہیں۔ انوری کے دوشعر ہم سطورِ بالامیں نقل کرآئے ہیں اس کے ہاں عربیت اور فلسفہ آرائی کا رجحان پایاجاتا ہے ۔قصیدہ گوئی میں وہ بھی کسی سے پیچھےنہیں بلکہ اس کا اصل میدان ہی قصیدہ ہے اگر چہ وہ دوسری اصناف میں بھی بند نہیں ۔دوضخیم جلدوں اور دس ہزارسے زیادہ ابیات سے بھرے دیوان میں[(۳۵)] غزل کی رنگا رنگی بھی ہےلیکن یہاں بھی اس کی طبع قصیدہ رس اپنے مزاج کی جانب ہی مائل دکھائی دیتی ہے۔زندگی میں اس نے کئی بارقصیدہ گوئی ترک کرنے کا ارادہ کیالیکن معاشی ضروریات اسے پھراس میدان میں گھسیٹ لاتی تھیں ۔

بہ ہرحال ان بحثوں سے قطع نظر یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ نظیری اور انوری جیسوں کو خاطر میں نہ لانے والےظفرعلی خان نے اپنے اشعار میں حالی کی بو کاپایاجانا باعثِ افتخارقراردیاہے ۔

حالی سے اثر پذیری کا ایک اظہارظفرعلی خان کی وہ نظمیں کررہی ہیں جن میں وہ حالی کی غزلیات کی تضمین کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کلامِ حالی سے اس نسبت کے بارے میں خاصے محتاط بھی ہیں ہم نے اپنی کتاب

مکاتیب ظفرعلی خان میں ان کی ایک دست نوشتہ فہرست منظومات شائع کی تھی جو دراصل ان کے ضخیم ترین شعری مجموعے بہارستان کا ایک ورق ہے۔ اس میں ایک نظم کا عنوان ''حالی کے چنداشعار کی تخمیس'' ہے[۳۶] لیکن کتاب چھپنے تک اس کا عنوان ''حالی کے چندابیات کی تخمیس'' کیا جاچکا تھا[۳۷] ویسے تو دونوں ہی عربی کے الفاظ ہیں اوراردو میں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔عربی میں البتہ 'شعر' سے 'شاعری' مراد لی جاتی ہے اور بیت سے ایک شعرمراد ہوتا ہے،ظفرعلی خان نے پوری غزل کے بجائے چنداشعار کی تخمیس کی ہے،شاید یہی فرق ان کے پیش نظر ہو؟ تبدیلی کا سبب جوبھی ہواس تبدیلی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظفرعلی خان عمومی طور پر اپنے کلام ہی پر نہیں عنوانات تک پرنظرثانی کیا کرتے تھے اور جس نظم کے عنوان میں حالی کا نام تھا اسے انھوں نے خاص طور پر دیکھا اور اس کے عنوان میں تبدیلی کردی۔ آیئے وہ نظمیں دیکھتے ہیں جو انھوں نے کلام حالی کی تضمین یا تخمیس کرتے ہوئے لکھیں۔ کلیات نظم حالی میں ردیف ''ے'' میں حالی کی مندرجہ ذیل دوغزلیں ظفرعلی خان کی توجہ کا مرکز بنی ہیں:

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیان رہے
شکوے وہ سب سنا کیے اور مہرباں رہے[۳۸]

اس غزل کا شمار۸۴ ہے۔دوسری غزل شمار۸۵ کا مطلع ہے:

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے[۳۹]

ظفرعلی خان نے کسی ایک غزل کے تمام اشعار کی تخمیس کرنے کی بجائے دونوغزلوں سے کچھ اشعار چن لیے ہیں اوران پر تین تین مصرعے کہہ کران کی تخمیس کی ہے پہلی غزل جوسات اشعار پر مشتمل ہے اس میں سے صرف تیسرا شعرلیا گیاہے دوسری غزل بھی سات اشعار پر مشتمل ہے اس میں سے دوسرا، پانچواں اور چھٹا شعران کی نگاہ انتخاب میں آئے ہیں۔ یہ خمسہ ۱۵رفروری ۱۹۱۲ء کو کہا گیا یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا حالی حیات تھے۔آیئے ان منتخب اشعار کی تخمیس دیکھتے ہیں:عنوان ہے؛حالی کے چندابیات کی تخمیس:

قرآں ہمارے قفلِ تمنا کی ہے کلید — نصرت کی جس نے دی ہے ہزیمت میں بھی نوید
لاتقنطوا کے بادہ کی جس سے ہوئی کشید — حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید
اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے

مشرق میں ٹھیکہ ایک نے تبریز کا لیا — مغرب میں دوسرے نے مراقش کو کھا لیا
جو ہم نے گُم کیا تھا وہ یورپ نے پا لیا — یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

دیتے ہیں چکمے ہم کو سر ایڈورڈ واہ واہ ظاہر میں آپ بنتے ہیں سلطاں کے خیرخواہ
در پردہ آپ رکھتے ہیں پاپا سے رسم و راہ کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رُو سیاہ
تم مدّعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

ان کو اطالیہ میں ہوس رانیوں سے کام ہم کو طرابلس میں پریشانیوں سے کام
دونوں کو اپنی اپنی خود افشانیوں سے کام دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے (۴۰)

کلیات حالی میں ردیف ''گ'' کی ایک غزل ہے

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں یا بھرنے کو خالی تفنگ (۴۱)

بارہ اشعار پر مشتمل اس غزل سے ظفر علی خان نے پہلا تیسرا، ساتواں، نواں، اور بارھواں شعر چنے ہیں اور اس خمسے کا عنوان ''خواجہ الطاف حسین حالی کی ایک غزل کے چند اشعار کی تضمین'' رکھا گیا ہے:

رنگ میں یہ ڈالتے رہتے ہیں بھنگ ہیں قیامت کے حریفانِ فرنگ
چڑھ نہیں سکتا ہے تلواروں پہ زنگ صلح ہے اک مہلتِ سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

توپ کیا بندوق کیا تلوار کیا کوٹ کیا ، پتلون کیا ، اخبار کیا
پوپ کیا اور شاہ کیا اور زار کیا عِلم کیا ، اخلاق کیا ، ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

جسم میں ہر روز اِتراتی ہے روح قوم کا غم رات دن کھاتی ہے روح
کون کہتا ہے گھٹی جاتی ہے روح کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا ، کھایا پیا سب آ کے انگ

ختم وہ اگلا فسانہ ہو چکا لکھ ہوئے ، خالی خزانہ ہو چکا
بے ٹھکانوں کا ٹھکانہ ہو چکا کام کا شاید زمانہ ہو چکا
دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی امنگ

ڈالتا ہے دل میں وسواس اتفاق خوب ہے پھٹکے نہ گر پاس اتفاق
کر ہی دے گا ستیاناس اتفاق قوم کو حالی نہیں راس اتفاق!
پھوٹ ہی کا بس کُھلے گا ہم پہ رنگ(۴۲)

....

ظفرعلی خان کے کلام میں ،کلام حالی سے براہِ راست نسبت رکھنے والی یہی دونظمیں مل سکی ہیں۔ ایک نظم کا رشتہ بالواسطہ حالی سے ہے۔ وہ ہے''انگلوعربیک کالج دہلی کے طلبہ سے خطاب'' چونکہ حالی ۱۸۷۵ء سے ۱۸۹۱ء تک کم وبیش سولہ برس اس ادارے میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اس لیے اس ادارے میں جانے پر ظفرعلی خان کے جذبات میں وہ ہلچل دکھائی دیتی ہے جس کے پس منظر میں مولانا حالی سے تعلق کی نسبت کارفرما ہی ہوگی۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے یوم علی کرم اللہ وجہ کے موقع پر ایک جلسہ اینگلوعربیک کالج دہلی میں منعقد ہوا تھا اس مناسبت سے غالباً ظفرعلی خان سے نظم یا پیغام کی فرمائش کی گئی ہوگی جس کے جواب میں انھوں نے ایک نظم سپردقلم کی جو جذباتِ قومی میں مولانا حالی سے ان کی ہم آہنگی کی آئینہ دار ہے۔ (۴۳)

یہ نظم دہلی میں ۱۳؍نومبر ۱۹۳۸ء کو کہی گئی جب کہ مولانا حالی کی وفات پر کم وبیش ربع صدی گزر چکی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں وہاں حالی سے اثر پذیری کے کچھ اشارے مل جاتے ہیں مثال کے طور پر ان کی نظم'' حیات جاوید'' جس کا عنوان حالی کی لکھی ہوئی سرسید کی سوانح عمری کی یاددلاتا ہے۔ اگرچہ نظم اپنے مضمون میں آزاد ہے۔ (۴۴)

....

تلمذ کا سوال

جہاں اس درجہ عقیدت و غایت درجہ وابستگی کا اظہار کیا جائے تو لوگ عام طور سے اس عقیدت ومحبت کو تلمذ پر محمول کرلیا کرتے ہیں جس سے سوانح نگاروں اور قارئین کے لیے مشکلات پیدا ہوجایا کرتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی اقبال اورظفرعلی خان کے باب میں ہوا۔ دونو کو ایک زمانے میں نواب مرزاداغ دہلوی سے عقیدت رہی اور دونو ان کی زبان دانی کے قائل و مداح رہے جس کا اظہار ان مرثیوں سے بھی ہوتا ہے جوانھوں نے داغ کی وفات پر لکھے بس انھی وجوہ سے یہ خیال کرلیا گیا کہ یہ دونو نابغے ،داغ کے شاگرد تھے۔ اقبال نے تو پھربھی ابتدامیں داغ کو ایک آدھ غزل اصلاح کے لیے بھیجی لیکن ظفرعلی خان کا معاملہ تو اتنا بھی نہ تھا۔ ظفرعلی خان نے البتہ داغ کا مرثیہ ضرور لکھا(۴۵) جو ظاہر ہے کہ دلیلِ تلمذ نہیں ۔اقبال نے بھی داغ کا مرثیہ لکھا ہے،(۴۶) جہاں تک حالی کا تعلق ہے ظفرعلی خان ابتدا ہی سے حالی سے متاثر دکھائی دیتے ہیں وہ ان کی شخصیت اورفن دونو سے متاثر تھے لیکن اس سے یہ مطلب لیاجائے کہ وہ ان کے شاگرد تھے یاوہ اصلاح کے لیے اپنی نظمیں انھیں بھیجا کرتے تھے(۴۷) تو یہ درست نہیں ہوگا۔ حالی کی خدمت میں اپنی کتابیں بھیجنے یا ان سے اثر پذیری کا اعتراف،تلمذ کے لیے کافی دلیل نہیں ۔

ظفرعلی خان کو حالی کا شاگرد کہنے کی بنیاد قیاس پر ہے چونکہ ظفرعلی خان کی نظم پر حالی نے رائے دی ہے

اس لیے یہ خیال قائم کر لیا گیا کہ ظفر علی خان انھیں اپنی نظمیں بھیجا کرتے تھے یہاں تک بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، جونیر شعرا چاہتے ہیں کہ ان کا کلام سینئرز کی نظر سے گزرے لیکن یہ قیاس بالکل بے بنیاد اور بے اصل ہے کہ وہ اصلاح کے لیے نظمیں بھیجا کرتے تھے پھر حالی نے تو ظفر علی خان کی شاعری اور نثر دونو کو سراہا ہے جیسا کہ آئندہ سطور میں تفصیل آ رہی ہے۔ اس ستایش سے بھی حالی کا تلمذ نہیں بلکہ دونو کی معاصرت ظاہر ہوتی ہے ایک سینئر اور ایک جونیئر ادیب کی معاصرت جس میں باہم احترام ومحبت کا رشتہ ہے نہ کہ استادی شاگردی کا۔ جہاں تک داغ کی شاگردی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں خود ظفر علی خان کا بیان کافی ہے انھوں نے اس حوالے سے شورش کاشمیری کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا:

> ''داغ کے استاد ہونے میں کلام نہیں وہ شاعری میں ایک خاص اسکول کے بانی تھے، قدرت نے ان میں بہت سی ادبی وشعری خوبیاں جمع کر دی تھیں لیکن ان کی عادت تھی کہ آپ نے ان سے کوئی شعری مشورہ لیا نہیں یا کسی لفظ کے سرراہے معنی پوچھ لیے اور انھوں نے اپنے شاگردوں کی فہرست میں آپ کا نام ٹانک لیا............ممکن ہے کبھی کسی شعر پر کوئی مشورہ لیا ہو مگر میں ان کا شاگرد نہیں'' (۴۸)

دکن ریویو میں کلامِ حالی

گزشتہ سطور میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ظفر علی خان نے حالی کو دکن ریویو کے لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ افسوس ہے کہ دکن ریویو کے تمام شمارے محفوظ نہیں۔ جو چند شمارے ہمیں دستیاب ہو سکے ان کی ورق گردانی سے ان میں مولانا حالی کی بعض تحریریں یا ان کی بعض تحریروں کا تذکرہ مل گیا۔ مثال کے طور پر دکن ریویو کے اسلام نمبر کے دوسرے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پہلے حصے میں مولانا حالی کی کچھ رباعیات شائع ہوئی تھیں۔ دوسرے حصے میں دکن ریویو کے ایک قاری نے رائے دیتے ہوئے جونپور سے لکھا ہے: ''جذبات حالی چونکہ ایک فخر قوم شاعر کی طرف منسوب ہیں اس لیے تعریف سے مستغنی ہیں ہمیں ان کو پڑھ کر جذبہ آئے یا نہ آئے حسن عقیدت سے دیکھتے اور غور کرتے ہیں'' (۴۹)

جن شماروں میں حالی کی تحریریں شائع ہوئیں ان میں اگست ۱۹۰۴ء کا شمارہ بھی شامل ہے جس میں حالی کی ایک غزل ملتی ہے (۵۰) عنوان ہے ''کلام حالی'' (شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی)

(۵۱) نہ عیشِ کیخسروی رہے گا نہ صولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی
رہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گے تارے تم آسماں کے
سدا کسی کی بنی رہی ہے نہ یاں کسی کی بنی رہے گی
گرایا تورانیوں کو تو نے، پچھاڑا مازندرانیوں کو

کہاں تلک اے شرابِ غفلت یہ تیری مرد افگنی رہے گی
صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی
بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی
رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی
قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبولِ عام ہونا
رہو گے گر حسنِ ظن کے طالب تو تم سے یاں بدظنی رہے گی
کرے گی کچھ عقل رہنمائی، نہ علم سے ہو گی کچھ صفائی
گناہ کی گندگی میں دنیا یونہی ہمیشہ سنی رہے گی
جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت ان کی غنی رہے گی

....

ظفرعلی خان جب حیدرآباد سے کرم آباد آ گئے تو ان کے دکن ریویو نے پنجاب ریویو کی شکل اختیار کرلی یہاں آنے اور پنجاب ریویو کے اجرا کے بعد بھی ظفرعلی خان اور ان کے رسالے پر مولانا حالی کا التفات جاری رہا۔ پنجاب ریویو میں بھی مولانا حالی کا کلام شائع ہوا۔ذیل میں مولانا حالی کی ایک نایاب نظم پیش کی جارہی ہے جو اگست ۱۹۱۰ء کے پنجاب ریویو میں شائع ہوئی۔یہ نظم پنجاب ریویو سے لے کر سرعبدالقادر کے مخزن نے ستمبر ۱۹۱۰ء میں شائع کردی تھی مخزن میں اس کا عنوان بایں صورت مندرج ہے:

ہیرا اور آبگینہ

مولانا حالی مدظلہ کے مندرجہ ذیل اشعار تبرکاً پنجاب ریویو بابت اگست سے نقل کیے جاتے ہیں:

ازرہ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس مپرس اور قدروقیمت تیری ہیچ تیرے پانے کی خوشی اور کچھ نہ گم ہونے کا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
مجھ میں اور تجھ میں مگر کرسکتے ہیں جو امتیاز ہیں مبصر ایسے اس بازارِ ناپرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں

تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑرہتے ہیں ہم (۵۲)

حالی بنام ظفر علی خان:

حالی اور ظفر علی خان کے باہمی ربط کا اندازہ لگانے کے لیے ایک نہایت اہم ذریعہ وہ خطوط ہیں جو حالی نے ظفر علی خان کے نام تحریر کیے۔ افسوس کہ حالی کے نام ظفر علی خان کا کوئی خط دستیاب نہیں جس سے ان روابط کی دوطرفہ گرمجوشی ظاہر کی جاسکتی۔ حالی کے خطوط، حالی کی شخصیت کی طرح سادہ، بے تکلف اور مربوط ہیں۔ آرائشِ بیان کا کوئی حربہ، اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوئی خواہش ان خطوں میں دکھائی نہیں دیتی۔

﴿۱﴾

پانی پت

۱۱/مارچ ۱۹۰۵ء

عزیزی۔

اس وقت حُسن اتفاق سے تھوڑی دیر کے لیے مکروہاتِ خانگی سے نجات ملی تھی۔ جنوری کا دکن ریویو سامنے رکھا ہوا تھا جس کو تفصیلی نظر سے اب تک نہ دیکھا تھا۔ سرے ہی پر آپ کی نظم جو ''رودموسیٰ'' پر لکھی گئی تھی، نظر پڑی۔ اوّل سے آخر تک بہت غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔ میرا حال اب یہ ہوگیا ہے کہ پُرانی طرز کی نظمیں تو (الاماشاء اللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ اُن میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گومضامین نئے نئے ہوتے ہیں۔ مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو ''جادو'' کے سوا اور کسی لفظ کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جاسکتا، کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہوگیا۔ (۵۳) مرثیہ دیکھ کر بھی مجھے ایسا ہی تحیر ہوا تھا لیکن اُس وقت آپ کے دل کو لگی ہوئی تھی اور ایسا کلام جو دل کے جوش پر مبنی ہوتا ہے۔ (۵۴) خواہی نخواہی مؤثر اور دلکش ہوتا ہے لیکن رودموسیٰ پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے، یہ محض زورِ طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہوجائیں تو کچھ اُمید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دُکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کبھی کچھ طبع آزمائی کرتا۔ مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھ (۵۵) والے بھی اب ہماری طرح پادررکاب ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں بشرطیکہ آپ کو فکرِ معاش دم لینے دے اور یہ چیٹک بھی دل کو لگی رہے۔ امید ہے کہ آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام خیر ختام۔

خاکسار
الطاف حسین حالی (۵۶)

﴿۲﴾

پانی پت ۔۱۵/اگست ۱۹۱۰ء

عزیزی عزیز الوجود۔ دام بقائہم

افسوس ہے کہ میری صحت نے اب بالکل جواب دے دیا ہے۔ نت نئی شکایتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ۔ نہ دوستوں کے خطوں کا جواب لکھا جاتا ہے، نہ اُن کی عنایتوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے ، نہ اُن کی تازہ مضامین و تصنیفات پر مسرّت کا اظہار کیا جاسکتا ہے جو قوم کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ نہ وعدوں کا ایفا ہوسکتا ہے ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر چند اپنا کلام نظم ونثر اردو فارسی وغیرہ مرتب کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ کسی سے یہ اُمید نہیں کہ میرے بعد کوئی اِس کو، بوجہِ دلخواہ نہ سہی، سرسری طور پر ہی مرتب کردے۔ اُردو زبان کی تذکیروتانیث پر میں اپنے خیالات نہایت شوق سے ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر طبیعت کی نادرستی، کمزوری اور سب سے زیادہ مکروہاتِ دنیوی نے اِس ارادے کو اب تک پورا نہیں ہونے دیا۔

معرکۂ مذہب و سائنس (۵۷) کی نسبت بہ لحاظ ترجمے کی خوبی کے جو کچھ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے (۵۸)، اُس کو میَں مبالغے سے بالکل پاک سمجھتا ہوں اور ترجمے کے لیے اس کتاب کے انتخاب کرنے کو میں آپ کی اعلیٰ درجے کی قوتِ ممیّزہ کی ایک روشن علامت سمجھتا ہوں۔ اِس باب میں جو خط میں نے پہلے لکھا تھا، اُس کا جواب آنے پر جس طرح ہوسکا میں نے جستہ جستہ اس بے مثل کتاب کے اکثر حصے دیکھے اور اگر کچھ روز زندگی نے وفا کی تو جب موقع ملے گا، اُس کو بار بار دیکھوں گا۔

پنجاب ریویو (۵۹) کا پہلا نمبر جس خوبی سے شائع ہوا ، اُس کی کچھ تعریف نہیں ہوسکتی۔ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کا مضمون جے راجپوری صاحب کا مضمون اور ''مجذوب کی بڑ'' تینوں مضمون نہایت دلچسپ ہیں۔ لیکن سب سے اعلیٰ درجے کا وہ مضمون (۶۰) ہے جو اڈیٹر کے قلمِ جادو رقم نہیں ، بلکہ اعجاز رقم، سے مترشح ہوا ہے اور اس کے آخر میں جو چند اشعار (۶۱) آپ نے برمحل اضافہ کیے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ان الفاظ میں سرِ مُوتصنع کو دخل نہیں۔ وہ اشعار مولوی سیّد وحیدالدین صاحب نے مجھے اور سجاد حسین کو پڑھ کر سنائے تھے۔ قاری اور سامع سب وجد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت دے اور آپ اپنی خداداد لیاقت کے جوہر اسی طرح مدّت دراز تک ظاہر کرتے رہیں۔

میری مجبوری و معذوری کا آپ اسی بات سے بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ خط دسویں کو لکھنا شروع کیا تھا اور آج پندرھویں کو ختم کرنے بیٹھا ہوں، بشرطیکہ وہ آج ہی ختم ہوجائے۔ القصہ جس مضمون کے بھیجنے کا میں نے وعدہ کیا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور بھیجوں گا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ اُس کو پسند کریں گے یا نہیں۔ مجھے معمولی شکایتوں

اور ضعف و نقاہت کے علاوہ پانچ چار دن سے خفیف حرارت بھی رہنے لگی ہے۔ ذرا طبیعت صاف ہو جائے تو ضرور اِس مضمون کو صاف اور پورا کرکے خدمتِ شریف میں بھیجوں گا۔ بالفعل ایک فارسی قطعہ، جو مولوی چراغ علی مرحوم کی وفات پر (۶۲) سرسیّد کی زندگی میں لکھا تھا، اُس کی نقل بھیجتا ہوں:

قطعہ بروفاتِ مولوی چراغ علی مرحوم

آہ آہ از رحلتِ بے گاہِ اعظم یار جنگ — کزمیانِ رہ ز ہمراہاں عنان پیچیدو رفت
حیف دنیا را بہ پنجہ سالگی کردہ وداع — بزمِ مارا بزمِ ماتم باز گردانیدو رفت
مستفیداں پُر نہ کر وہ دامنِ معنی ہنوز — مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پا شیدو رفت
از سحابِ فیضِ کلکش ناشدہ سیراب خلق — ساعتے برقِ یمانی از افق تا بیدو رفت
عقدہ ہانکشودہ ماند و نکتہ ہانو شتہ ماند — بہرِ جوئے شیر کوہِ بیستوں کندید و رفت
کرد بے آزارِ خلق اعمال سلطانی ادا — نے زکس رنجیدو نے کس را بر نجا نیدو رفت
یاورانِ قوم را تازیست یا در بود و یار — ہر چہ بتوانست در تائید شاں کوشیدو رفت
از دلِ پُر دردِ او گاہے صدائے برنخاست — مُدّ تے چوں بحرِ کاہل در نہاں جو شیدو رفت
طبعِ آزادش بہر ملّت کہ بینی صلح داشت — در دلِ خویش و دلِ بیگانہ در گنجیدو رفت

گر زید صد سال کس انجامِ او مرگست و بس
چوں شرر بروضعِ دوراں میتواں خندید و رفت

اُمید ہے کہ آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔ والسّلام

خاکسار و دعا گو: الطاف حسین حالی (۶۳)

دیگر خطوط میں ظفرعلی خان کا ذکر:

مکتوباتِ حالی کے مجموعوں میں جہاں مولانا حالی براہ راست ظفرعلی خان سے مخاطب ہوتے دکھائی دیتے ہیں وہاں دوسروں کے نام ان کے خطوط میں بھی ظفرعلی خان کا ذکر ملتا ہے اور یہی حال ظفرعلی خان کا بھی ہے۔ اگرچہ مولانا حالی کے نام ظفرعلی خان کا کوئی خط تو دستیاب نہیں لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام ایک طویل خط میں مولانا حالی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ خط ظفرعلی خان اور محفوظ علی بدایونی نے مل کر لکھا ہے، اس نادر خط کا متن اور تفصیلی مطالعہ ہم شائع کر چکے ہیں، (۶۴) اس خط میں ایک مقام پر ظفرعلی خان، اپنے دوست عبدالحق سے پوچھتے ہیں:

’’کیا مولانا حالی ابھی تک حیدرآباد ہی میں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر ہوں تو میرا اُن کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کر دینا۔

ہاں جو ریویو ڈراما (۶۵) پر لکھنے کا اُنھوں نے وعدہ فرمایا تھا وہ ضرور لکھوا کر کسی بڑے اخبار مثلاً پیسہ

اخبار [۶۶] یا وطن [۶۷] یا وکیل [۶۸] میں چھپنے کے لیے بھیج دینا۔ظفر''

مولانا حالی کو نظام حیدرآباد کی طرف سے ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد بلایا گیا تھا تا کہ وہ چالیس سالہ جشن کی روداد لکھ سکیں اور اس مقصد کے لیے انھیں دو معاونین بھی دیے گئے جن میں ایک مولوی عبدالحق تھے۔ یہ دسمبر ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔ ظفرعلی خان یہ خط مئی ۱۹۰۶ء میں لکھ رہے ہیں۔وہ چونکہ حیدرآباد سے غیر حاضر اور بربرہ میں اپنے دوست محفوظ علی بدایونی کے پاس مقیم ہیں اس لیے انھیں معلوم نہیں ہے کہ مولانا حالی کب تک حیدرآباد میں رہے۔ مولانا حالی ۷/جون ۱۹۰۶ء تک حیدرآباد میں تھے۔اس کے بعد وہ پانی پت واپس چلے گئے تھے۔جس ریویو کا ذکر ظفرعلی خان کر رہے ہیں وہ نہ لکھا جا سکا جیسا کہ مولانا حالی کے ایک خط بنام عبدالحق میں کی گئی معذرت سے معلوم ہو جاتا ہے۔مولانا نے لکھا ہے:۔''معلوم نہیں ظفرعلی خان بربرہ سے واپس آ گئے ہیں یا نہیں اگر آ گئے ہوں تو میری مجبوری و لاچاری کا حال ان سے کہہ دیجیے گا'' [۶۹]

اسی طرح یہ بھی لکھتے ہیں کہ:''میں نے اسی پریشانی میں ایک ال نامہ فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا تھا۔ پچاس ساٹھ جملے لکھے تھے اب بہت دن سے کچھ نہیں لکھا اگر وہ پورا ہو گیا یعنی پورے سو جملے بھی لکھے گئے تو دکن ریویو کے لیے بھیجوں گا مگر میں اس کے ساتھ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا'' [۷۰] یہ مکتوب بہ ظاہر بلا تاریخ ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوبات حالی میں جو بلا تمہید عبارت مکتوب نمبر ۵۴ کے تحت لکھی گئی ہے وہ الگ خط نہیں بلکہ اسی خط کا حصہ ہے اور سہواً الگ ہو گئی ہے اس کے آخر میں تاریخ ۸/ستمبر ۱۹۰۶ء درج ہے اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس خط کی تاریخ یہی ہونی چاہیے لیکن شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے کلیات نثر حالی میں اس خط کی تاریخ ۲۹/اگست ۱۹۰۶ء لکھی ہے اور اس کا اختتام مکتوبات حالی میں مندرج مکتوب کی عبارت سے مختلف کیا ہے۔[۷۱] بہ ہر حال اس خط سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا حالی اپنے زیرِقلم منصوبوں کے لیے بھی کسی اور رسالے کی بجائے دکن ریویو ہی کو ترجیح دیتے تھے۔جہاں تک اس''ال نامہ'' کا تعلق ہے یہ غالباً مکمل نہ ہو سکا اور اب اتنے ہی''ال'' دستیاب ہیں جو مولانا حالی نے اپنے اس مکتوب گرامی میں بہ طور نمونہ درج فرما دیے تھے یہ تمام''ال ''معاشرت و تمدن سے متعلق حالی کے بے تکلف خیالات ہیں شاید اسی لیے وہ انھیں اپنے نام سے شائع نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ایسا کرنے میں انھیں خوف فساد خلق لاحق تھا۔آیئے اس''ال نامہ'' کے ان اندراجات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو مولانا حالی نے قلم بند فرمائے تھے۔ان جملوں کے بارے میں خود مولانا حالی کی رائے یہ ہے کہ:''یہ جملے مسودہ دیکھ کر نہیں لکھے اس لیے ان میں ترتیب باقی نہیں رہی۔ اگر آپ کو یہ جملے پسند ہوں تو مجھے لکھیے تا کہ ان کی تعداد سو تک پہنچا کر آپ کو لکھ بھیجوں مگر میرا نام کسی پر ظاہر نہ کیجیے گا ورنہ پھر ان کا اخفا کرنا ناممکن ہو گا'' [۷۲] اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ''ال نامہ'' ہنوز ایک خیال تھا جسے معرضِ تکمیل میں لانے سے پہلے وہ اس پر اپنے عزیزوں کا ردِعمل جاننا چاہتے تھے اور وہ اس باب میں اپنے نام کا اخفا بھی چاہتے تھے۔جو جملے لکھے گئے وہ درج ذیل ہیں:

المذہب: اعلان جنگ

الدین: تقلید آبا و اجداد

العلم: قسمی از جہل مرکب
الامتحان: آزمائش لیاقت ممتحنان
الیونیورسٹی: کارخانہ کلرک سازی
المسلمانان ہند: چون مار گزیدہ از ریسمان ترسندگان☆
العلی گڑھ پارٹی: شہید وفا
العلی گڑھ کالج: پرورش گاہ طفلان بدست مائندران☆
الانجمن ہائے اسلامیہ: سبزۂ برشکال☆
الاتفاق درمسلمانان: چون اجتماع در نقیضین ☆
الرئیس: آنکہ از ریاست بی خبر باشد☆
الامیر: آنکہ تہیدست وقرض دار باشد: ☆
المولوی: آنکہ مسلمانان راازدائرہ اسلام خارج می کردہ باشد☆
الواعظ: آنکہ درتفریق بین المسلمین خطانہ کند☆
الشکار: بہانہء آدم کشی ☆
الکمیشن: وجہ موجہ برائے فیصلہء یک طرفہ
النیشنل کانگرس: درحق تعلیم ہند چون بغاوت سنہ ۵۷ درحق اسلحہء اہل ہند (۷۳)

اس ''ال نامہ'' کا تعارف کرواتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: مولانا نے ایک ال نامہ بھی لکھا تھا جوان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا کیونکہ اس میں ہر فرقے اور ہر گروہ پر چوٹ ہے چند جملے انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں ......'' (۷۴)

اسی ''ال نامہ'' کی نسبت شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے کلیات نثر حالی میں لکھا ہے:

''مولانا حالی بہت ہی سنجیدہ اور متین بزرگ تھے مگر ابنائے زمانہ کی حالت کو دیکھ کر کبھی کبھی آپ کو خیال آتا تھا کہ مزاح کے رنگ میں ان کے اصلی رنگ کا اظہار کیا جائے۔ اس سلسلے میں آپ نے بزبان فارسی ایک 'ال نامہ' تصنیف کیا تھا جس کے ایک ایک جملے میں ایک ایک حقیقت پنہاں تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس قسم کے ایک سو جملے مرتب کر کے بغیر نام کے کسی رسالے میں چھپوائیں وہ سو جملے تو مرتب نہیں ہوئے مگر ان میں سے بعض انھوں نے ایک مرتبہ لکھ کر مولوی عبدالحق صاحب کو بھیجے تھے صرف وہی ہم تک پہنچ سکے ہیں باقی جو ذخیرہ انھوں نے ترتیب دیا تھا وہ مجھے ان کی ذاتی لائبریری میں نہیں ملا، اس لیے مجبوراً یہاں ان ہی فقرات کے پیش کرنے پر قناعت کرنی پڑتی ہے جو مولانا نے اپنے ۲۹ر اگست ۱۹۰۶ء کے خط میں مولوی

عبدالحق کو لکھ کر بھیجے تھے۔(محمد اسماعیل) (۷۵)

دوسروں کے نام خطوط میں ظفرعلی خان کے ذکر کی بہترین مثال مولانا حالی کا وہ خط ہے جو انھوں نے وجاہت حسین جھنجانوی (۷۶) کو لکھا۔ اس خط کے ساتھ انھوں نے اپنی وہ لافانی نظم ارسال کی ہے جو انھوں نے ''شکریہ مساعی جمیلہ مولانا ظفر علی خان'' کے عنوان سے لکھی تھی اور جسے وہ خود پڑھ کر ظفرعلی خان کو سنانا چاہتے تھے۔ یہ نظم جہاں مولانا حالی کی شخصیت اور کردار کا ایک تابندہ نقش ہے کہ وہ کس طرح اپنے ایک خورد کا حوصلہ بڑھاتے ہیں وہاں اس مضمون کی ابتدا میں پیش کیے گئے خیالات کے تناظر میں قوم، قومی کاموں اور قوم کے مستقبل کے ساتھ ان کے اخلاص اور وابستگی کا ایک لافانی نمونہ بھی ہے۔ اس نظم کی ایک اور اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ مولانا حالی کی آخری نظم بھی ہے۔ یہاں اس حقیقت کی وضاحت بے جا نہ ہو گی کہ مولانا حالی کے ایک اہم سوانح نگار شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اپنی کتاب تذکرہ حالی میں اس نظم کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا حالی نے اس نظم میں ظفرعلی خاں سے متعلق جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے، وہ مولانا حالی کے حقیقی جذبات نہ تھے بلکہ انھوں نے محض بعض ''سنی سنائی'' باتوں سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھ دی تھی۔ (۷۷)

حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے اور اس کی تردید خود مولانا حالی ہی کے اس خط سے ہو جاتی ہے جو انھوں نے یہ نظم ارسال کرتے وقت لکھا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

> پانی پت، ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء
>
> مکرمی! مولانا ظفرعلی خاں صاحب کا سفر مغرب سے مع الخیر مراجعت فرمانا آپ کو اور ہم سب کو مبارک ہو، جب وہ مغرب کی طرف روانہ ہوئے تو میں نے چند ابیات ان کی شان میں لکھی تھیں مگر جب وہ روانہ ہو گئے تو وہ نظم ناتمام رہ گئی۔ بمقام دہلی پانی پت سے تار دیا گیا تھا کہ لاہور جاتے ہوئے تھوڑی دیر یہاں بھی قیام فرمائیں۔ ارادہ تھا کہ یہ نظم میں خود ان کے سامنے پڑھوں مگر تار کا جواب غالباً نہیں آیا اور ہمارے واجب التعظیم مسافر بالا بالا لاہور کو روانہ ہو گئے لہٰذا ابیات پنسل سے صاف کر کے (قلم سے اب نہیں لکھا جاتا) آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ ناچیز ابیات زمیندار میں درج فرما کر ممنون فرمائیں گے۔
>
> زیادہ نیاز خاکسار الطاف حسین از پانی پت (۷۸)

مولانا حالی کا یہ خط ان کے اس نظم میں بیان کیے گئے جذبات کی صداقت کا شاہد عدل اور نظم میں پیش کیے گئے خیالات کی ناقابل تردید تصدیق ہے۔

ظفرعلی خان کا اعترافِ عظمت:

ظفرعلی خان کی جانب سے حالی کی عظمت کے اعتراف کے کچھ نمونے پہلے پیش کیے گئے اب ان کا لکھا ہوا ایک تبصرہ پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے رباعیات حالی کی اشاعت پر تحریر کیا۔ دکن ریویو کے شمارہ

جون و جولائی ۱۹۰۴ء میں ،جو افسانہ اور دکن ریویو کی مشترکہ اشاعت ہے، ''ریویو'' کے زیر عنوان ''ظفر علی خان بی اے ایڈیٹر'' کے قلم سے رباعیات حالی، گنجینہ امثال،انتخاب بہاردانش اور حیات صالح چار کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔سب سے پہلے رباعیات حالی پر تبصرہ ہے جس میں مولانا حالی کی شاعری اور رباعیات کی تعریف کے بعد ناشر اور کاتب پر تنقید کی گئی ہے ۔تبصرہ نگار کے نزدیک مولانا حالی کی تمام شاعری ہی اخلاقی پاکیزگی اور لطافت کا سرچشمہ ہے لیکن ان کی رباعیات کو اس بارہ میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک اس بات کی بہت بڑی ضرورت تھی کہ ان تمام رباعیات کو افادۂ خاص عام کے لیے یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے ۔چنانچہ اس خدمت کی انجام دہی پر وہ ناشر کو سراہتے ہیں لیکن ساتھ ہی اسے اس بات پر آڑے ہاتھوں لیتے ہیں کہ اس نے کتاب کے پشتے پر کتاب کا نام اور مولانا حالی کی تصویر کے نیچے ان کا نام انگریزی حروف میں کیوں لکھا ہے ان کے نزدیک اردو کتاب کا نام اردو حروف ہی میں لکھنا چاہیے خواہ وہ کتاب کی پشت ہی پر کیوں نہ ہو ۔ان کا کہنا ہے کہ انگریزی حروف کے استعمال کی اردو میں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے ان کو تو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور جو جانتے ہیں انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ انگریزی حروف کا استعمال یہاں بلاضرورت کیا گیا ہے۔ اگر ناشر اس اعتراض کا جواب دیتے تو ان کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جا سکتا تھا کہ اس زمانے میں تصویر بلاک کی مدد سے چھپتی تھی اور بلاکوں کے نیچے ڈھلے ڈھلائے انگریزی حروف میں عبارت لکھنا آسان ہوتا تھا اردو حروف یا تو نسخ میں لکھنا پڑتے تھے یا پھر ان کے لیے الگ بلاک بنوایا جاتا تھا تصویر کے نیچے، نسخ زیبائی میں کمی آجانے کے باعث استعمال نہیں کیا جاتا تھا اور بلاک بنوانے میں خرچ زیادہ آتا تھا اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا تھا لیکن یہ اعذار فنی ہیں اور مولانا کا اعتراض جذباتی ۔معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے بارے میں ان کی عصبیت بھی اقبال کی مانند مذہبی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔

ریویو: رباعیات حالی

اصناف شاعری میں رباعی ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں شاعر فلسفیانہ خیالات کو بوجہ احسن ادا کر سکتا ہے ۔مولانا حالی کا یوں تو کل کلام اردو زبان میں اخلاقی پاکیزگی اور لطافت کا سرچشمہ ہے لیکن ان کی رباعیات کو اس بارہ میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور اس بات کی بہت بڑی ضرورت تھی کہ ان تمام رباعیات کو بہ نظر افادۂ خاص و عام ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ اس ضرورت کو مولوی رحمت اللہ صاحب رعد نے بہ اسلوبِ زیبا پورا کیا اور ایک چھوٹی تقطیع کی خوشنما مجلد کتاب جس کا سرورق مولانا حالی کی ایک عمدہ عکسی شبیہ سے مزین ہے پبلک کے سامنے پیش کی۔ رعد صاحب چھپائی کے فن میں جو شہرت حاصل کر چکے ہیں اگر چہ وہ اس سے مستغنی ہے کہ اس کتاب کے ظاہری حسن کی تعریف میں کچھ بھی لکھا جائے

حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را

لیکن ہم دو امور کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ دیے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ اول تو رعد صاحب نے دو جگہ

انگریزی حروف کا استعمال کیا ہے جس کی مذاق سلیم ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ کتاب کے پٹھے پر عربی یا فارسی حروف کے بجائے انگریزی خط میں رباعیات حالی لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد مولانا حالی کی تصویر کے نیچے ان کا نام بھی انگریزی ہی میں درج ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ انگریزی حروف کے استعمال کی ایک اردو میں کیا ضرورت تھی۔ جولوگ انگریزی نہیں جانتے ان کو تو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور جو جانتے ہیں انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ انگریزی حروف کا استعمال یہاں خوامخواہ بلاضرورت کیا گیا ہے۔

دوسرا امر جس پر کتاب کھولتے ہی نظر پڑتی ہے کاتب کتاب کی مہتم بالشان شخصیت ہے جو ہر صفحہ سے ٹپک رہی ہے اگر کسی کتاب کے ہر صفحہ پر مختلف اسالیب سے اپنا نام درج کرنا کسی شخص کے لیے بقائے دوام کا ذریعہ ہوسکتا ہے تو اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ منشی الطاف حسن کا تب رباعیات حالی زندہ جاوید ہوگئے ۔منشی صاحب کبھی اپنے آپ کو الطاف لکھتے ہیں اور کبھی الطاف حسن۔ کہیں یہ کتبہ الطاف حسن لکھنوی تحریر کرتے ہیں اور کہیں احقر الزمن الطاف حسن'' ایک جگہ رقم بندہ لم یزل الطاف حسن' اپنا موٹو بناتے ہیں اور ایک جگہ کتبہ احقر الطاف حسن لکھنوی'' ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اس شہرت عام میں کاتب صاحب کو اپنے استاد کا بھی شریک کرنا مقصود ہے لہٰذا جابجا استاد کا بھی ذکر کردیا ہے۔''کتبہ الطاف حسن لکھنوی شاگرد اعجاز رقم ۔ کتبہ خاکسار الطاف حسن شاگرد جناب مفتی شمس الدین صاحب اعجاز رقم لکھنوی'' اور اسی قسم کے متنوع انداز بیان سے اپنا اور اپنے استاد کا نام ہر رباعی کے نیچے درج کیا ہے ۔ بقول معزز ہمعصر مخزن''منشی الطاف حسین صاحب کاتب کتاب کو خوش نویسی کے آسمان کے آفتاب ہی سہی لیکن آفتاب بھی تو تھوڑی دیر کو چھپ جایا کرتا ہے''

اس کتاب میں تقریباً ایک سو رباعیاں ہیں اور ہر ایک اخلاق کا ایک بے بہا موتی ہے مثال کے طور پر ہم چار رباعیاں درج ذیل کرتے ہیں جن حضرات کو اس قسم کے انمول موتیوں کی تلاش ہو وہ صرف ۱۰ از بھیج کر مولوی رحمت اللہ صاحب رعد مالک مطبع نامی واقع کانپور سے منگوالیں۔

(۱)

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

(۲)

زاہد کہتا تھا جان ہے دین پر قربان
پر آیا جب امتحان کی زد پر ایمان
کی عرض کسی نے کہیے اب کیا ہے صلاح

فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہان

(۳)

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجھ کوہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

(۴)

موسیٰ نے عرض کی اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

......................................ایڈیٹر (۷۹)

کمال اعتراف:

۱۹۱۲ء میں پریس ایکٹ کے نفاذ پر ظفر علی خان انگلستان روانہ ہوئے ، انگلستان سے واپسی پر وہ ''دارالخلافت قسطنطنیہ پہنچ کر خلیفۃ المسلمین اعلیٰ حضرت محمد خان خامس کی جناب میں باریاب ہوئے ۔ اور غازیان اسلام کے لیے، جن کے مقدس خون سے ان دنوں بلقان کی وادیاں سیراب ہورہی تھیں برطانوی ہند کے دورافتادہ اوربیکس مسلمانوں کی دعاؤں کا یقین دلایا۔ نیز مسلمانوں کی طرف سے ایک لاکھ پانچ ہزارروپے کی رقم ایک نذرِ محقر کے طور پر خود صدرِاعظم محمود شوکت پاشا کی خدمت میں پیش کی تھی جو اس وقت تک آپ نے برطانوی ہند میں بلقان کے ترکی مہاجرین کے لیے جمع کی تھی۔ اس باسعادت سفر کے بعد جولائی ۱۹۱۳ کے تیسرے عشرے میں جب ظفر علی خان وطن واپس لوٹے تو بمبئی ، دہلی اور اس کے بعد لاہور میں مسلمانوں نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ (۸۰)

ظفر علی خان کی ملی خدمات کو جس بڑے پیمانے پر محسوس کیا گیا تھا۔ ان کے استقبالیہ جلوس میں بمبئی سے دہلی آنے پر ہجوم اس قدر تھا کہ ایک نوجوان اس میں کچلا گیا۔افرادقوم کے دلوں میں ظفر علی خان کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جان ہار جانے والا وہ نوجوان اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا جب اس کی غم نصیب ماں کو اس حادثے کی اطلاع دی گئی تو اس نے مامتا کو پہنچنے والے فطری صدمے کے علی الرغم کہا کہ ''میرے اور دس بچے ہوتے وہ بھی ظفر علی خان پر نثار کرتی تو مجھے ملال نہ ہوتا'' (۸۱)

یہ تھی وہ کیفیت جس میں حالی جیسے دل دردمند رکھنے والے شاعر نے قوم کے اس قابل فخر نوجوان کی خدمات اور صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا ۔ یہ خراج تحسین محض چندرسمی جملوں یا پھیکے شعروں پر مشتمل نہیں تھا بلکہ

یہ ایک مکمل اور طویل نظم تھی جس میں نہایت فراخ دلی کے ساتھ ظفرعلی خان کو شیر دل اور نازش قوم اور فخر اقران قرار دیا گیا تھا۔ہم گزشتہ سطور میں کسی مقام پر یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جولوگ اس نظم کو مولانا حالی کی جانب سے سنی سنائی باتوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں وہ نہ تو ظفرعلی خان سے انصاف کرتے ہیں نہ ہی مولانا حالی سے کہ مولانا حالی ایسا انصاف پسند اور لفظوں کا پارکھ فن کار محض سنی سنائی باتوں پر اتنا بڑا اخراج تحسین پیش نہیں کرسکتا۔وہ ظفرعلی خان کو جانتے تھے اور ان کے ادبی قد وقامت کے ساتھ ان کی ملی خدمات سے بھی آگاہ تھے۔یہی سبب تھا کہ وہ محض یہ نظم کہہ کر ارسال نہیں کردیتے بلکہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ اسے خود ظفرعلی خان کے روبرو پڑھ کر انھیں سنائیں۔جیسا کہ وجاہت حسین جھنجانوی کے نام ان کے خط سے ظاہر ہے جو انھوں نے یہ نظم ارسال کرتے ہوئے اس کے ساتھ لکھا اور جس میں وہ ظفرعلی خان کو واجب التعظیم مسافر قرار دیتے ہوئے ان کا سفر مغرب سے مع الخیر مراجعت فرما ہونا سب کے لیے قابل مبارک قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ اپنی یہ نظم ظفرعلی خان کی شان میں پیش کرنے کی خواہش رکھتے تھے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے وطن پانی پت سے دہلی تار بھی دیا تھا کہ ظفرعلی خان''لاہور جاتے ہوئے تھوڑی دیر یہاں بھی قیام فرمائیں'اس سے مقصود ان کی خدمت میں اس نظم کا پیش کرنا بلکہ ان کے سامنے پڑھنا تھا۔ظفرعلی خان اپنے استقبال کے ہنگاموں میں اس تار کا جواب نہ دے سکے جس پر مولانا حالی نے یہ نظم ایڈیٹر زمیندار کو بذریعہ ڈاک روانہ کی (مکمل خط خوانندگان کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں) اس نظم کے حوالے سے خود ظفرعلی خان نے اپنے احوال کی شرح کرنے والے مضمون ازالۃ الخفا کی آخری قسط میں لکھا تھا کہ''ترجمان الاسلام علامہ حالی علیہ الرحمہ کی نظم ایسی تھی کہ جس کو میں اپنی کلاہِ افتخار کا درخشاں ترین طرہ سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہوں''[۸۲] حالی کی یہ نظم ظفرعلی خان کی کلاہ افتخار کا درخشاں ترین طرہ ہونے کے علاوہ بہ قول پروفیسر حمید احمد خان کچھ اور پہلوؤں سے بھی اہم ہے ایک تو یہ کہ یہ حالی کی آخری نظم ہے دوسرے''مشرق میں ہوں دردِل سے بے چین +مغرب میں سنیں جو رنج اخواں''جیسا شعر کہہ کر''حالی نے اس نظم کو مسلمانانِ برعظیم کے ملی شعور کا ترجمان بنادیا ہے''[۸۳] یہ تاریخی نظم ظفرعلی خان نے اپنے ضخیم ترین شعری مجموعے بہارستان میں بہ طور تمہید شامل کرلی تھی۔نظم کا عنوان''شکریہ مساعی جمیلہ ظفرعلی خان''ہے:

اے مالکِ دفترِ زمیندار — اے نازشِ قوم و فخرِ اقراں
اے روح دروانِ جمع احباب — اے چشم و چراغ بزمِ اخواں
اے دین کے امتحان میں جانباز — اے نصرتِ حق میں تیغِ عریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر — اے شیر دل اے ظفر علی خاں
قدرت نے بھرے تھے تجھ میں جوگن — جب تک وہ رہے نظر سے پنہاں
فوقیت و برتری پہ تیری — قائم کوئی ہو سکی نہ برہاں
پر وقت کی تاک میں برابر — ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ — اٹھا ستم و جفا کا طوفاں

ہمدردیِ اہلِ دیں نے آخر جوہر ترے کر دیے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر دامن ہوا چاک تا گریباں
پھیلے وہ بہ شکلِ سیل آتش دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
ڈالا یہ تری پکار نے غل جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
جو دل غمِ قوم سے تھے بے حس چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں
وہ بن گئے آپ اپنے رہزن جو مال کے اپنے تھے نگہباں
اسلام کی سمجھے اب حقیقت جو نام کے تھے فقط مسلماں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں
نازاں ہے وہ درس گاہ تجھ پر تعلیم پر جس کی تو ہے نازاں
کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند جو قوم کے درد کے ہو درماں
سوزِ غمِ دین حق سے جن کے سینے ہوں کباب دل ہو بریاں
جو ملک و وطن کے ہوں فدائی جو قوم کے نام پر ہوں قرباں
مشرق میں ہوں درد دل سے بے چین مغرب میں سنیں جو رنجِ اخواں
پنجاب کو تجھ پہ ہے اگر فخر ہے اس کو یہ فخر و ناز شایاں
زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں (۸۴)

حالی کی وفات پر زمیندار کا ردعمل:

ظفرعلی خان ۱۹۱۲ء کے سفرِ انگلستان کے بعد جب ہندوستان واپس آئے تو انھیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا تھا جس کی تفصیل ہم اپنے مقالے ’’شبلی اور ظفرعلی خان‘‘ میں پیش کر چکے ہیں۔(۸۵) کرم آباد میں نظر بندی کے زمانے میں ان پر اخبار کی ادارت اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی عاید رہی جو طویل قلمی جدوجہد کے بعد ایک غیر سیاسی علمی و ادبی ہفت روزے ستارۂ صبح کے اجرا کی اجازت ملنے پر ختم ہوئی مولانا حالی کا انتقال ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہوا یہ وہی زمانہ ہے جب ظفرعلی خان پر پابندی عاید تھی ااور اخبار کی پیشانی پر بھی بہ طور مالک بیگم صاحبہ ظفرعلی خان لکھا جاتا تھا ایسے میں وہ اپنے اخبار میں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے ان کے مقرر کردہ ایڈیٹر ہی اخبار چلاتے تھے۔ اس زمانے میں علامہ عبداللہ عمادی زمیندار کے مدیر تھے جو یقیناً ظفرعلی خان کی ہدایات کے مطابق اخبار کی ادارت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ہم نے یہ دیکھنے کے لیے کہ مولانا حالی کی وفات پر زمیندار کا ردعمل کیا تھا زمیندار کے اس زمانے کے فائل تلاش کیے تو معلوم ہوا کہ اس زمانے کے بہت کم شمارے محفوظ ہیں ان میں بھی ہمیں اس حوالے سے صرف تین خبریں دستیاب ہوئیں چونکہ یہ تینوں خبریں اہم ہیں لہٰذا ذیل میں ان تینوں کو نقل کیا جارہا ہے تاکہ مولانا حالی کی وفات پر ظفرعلی خان کے زمیندار کا ردعمل محفوظ

کیا جاسکے: سب سے پہلے مولانا حالی کی وفات کی خبر ''ایک دوسرا آفتاب بھی غروب ہوگیا'' کے زیرعنوان شائع ہوئی ۔فہوھذا

ایک دوسرا آفتاب بھی غروب ہو گیا
شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم

ہنوز دنیائے علم وفضل شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کی تعزیت سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ عالم ادبی کو حضرت مولانا حالی کے فاجعۂ انتقال سے ایک دوسرا ناقابل تلافی صدمہ اٹھانا پڑا، وہ حالیؒ ہندوستان کا سعدی تھا ،جس نے اردوعلم ادب کو زندہ کیا، جو اسلامی بیداری کا پہلا محرک تھا، جس نے مسلمانوں کو بتایا کہ فیض قدرت نے اُن کے لیے کیا کیا سامان کیے ہیں، ان میں کیسی عظیم الشان ودیعتیں مخفی ہیں، وہ کن بدیع المثال طاقتوں کے گنجینہ وار ہیں اور اب ان خزائنِ قدرت کو کس طرح بھولے ہوئے ہیں کہ ہماری اخلاقی و ادبی قابلیت کے جواہر پارے دستمال اغیار ہورہے ہیں اور ہم کو خبر تک نہیں ہوتی، افسوس ہے کہ زمانہ نے ہم سے ایسے فرد فرید کو چھینا ہے جس کی ہم پائیگی خود زمانہ بھی نہیں کرسکتا۔مولانا کا انتقال ۳۰ر دسمبر کی شب کو ہوا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

ہر دم زمانہ داغ دگر بر جگر دہد
یک داغ نیک ناشدہ داغ دگر دہد (۸۶)

....

پانی پت

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار

السلام علیکم: میں آپ کو دلی رنج و افسوس کے ساتھ یہ روح فرسا خبر سنانے پر مجبور ہوا ہوں کہ مسلسل ایک سال کی علالت کے بعد آخر ۳۰ر دسمبر ۱۴ء کو رات کے ایک بجے شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے اس دارفانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔ دوسرے روز یعنی ۳۱ر دسمبر کو ۱/۲ ۱۰ بجے صبح جنازہ اٹھایا گیا جنازہ کے ساتھ خواجہ سجاد حسین بی۔اے فرزند مرحوم آنریبل خواجہ غلام الثقلین بی اے ایل ایل بی ۔مسٹر شاہ عالم ایم ۔اے ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی سکول مولوی سید ظفر علی ہیڈ ماسٹر ایم۔بی سکول، مولوی ابو محمد محی الاسلام، مولوی عبدالسلام عباسی مولوی فاضل اور دیگر ہزارہا معززین شہر شریک تھے۔ ۳/۴ ۱۰ (پونے گیارہ بجے) نماز جنازہ پڑھی گئی جو حاضرین کے پے درپے آنے کی وجہ سے دومرتبہ ہوئی پھر ۳/۴ ۱۱ بجے اندرون درگاہ حضرت بوعلی شاہ قلندر یہ شاعری کا دیوتا سپرد خاک کردیا گیا اناللہ واناالیہ راجعون

راقم۔شیخ محمد اسمٰعیل اورینٹل ٹیچر مسلم ہائی سکول (۸۷)

....

ماتمِ حالی

انجمن حمایت اسلام لاہور کا ریزولیوشن

جناب ایڈیٹر صاحب روزنامہ زمیندار

السلام علیکم برائے مہربانی مندرجہ ذیل مضمون کو اپنے روزنامہ اخبار میں درج فرما کر ممنون کیجیے۔

عبدالعزیز۔ آنریری سیکریٹری

نہایت افسوس ہے کہ مولوی الطاف حسین صاحب حالی جو قوم کے سچے خیر خواہ اور ہمدرد تھے اس دارِ ناپائدار سے دارِ بقا کو انتقال کر گئے ہیں۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ اس حادثہ جاں گداز کے وقوع پر جنرل کونسل کے اجلاس منعقدہ ۳/جنوری ۱۹۱۵ء نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا ہے۔

مولانا الطاف حسین صاحب حالی کی وفات سے مسلمانانِ ہند کو صدمہ عظیم پہنچا ہے اور انجمن حمایت اسلام کا یہ اجلاس حادثہ جانکاہ پر دِلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

نیز قرار دیتا ہے کہ جملہ انسٹی ٹیوشن جو اس انجمن کی زیرنگرانی ہیں، انتقال پُر ملال کے غم میں ایک دن کے لیے (۵/جنوری ۱۹۱۵ء کو) بند کیے جائیں گے۔ (۸۸)

....

حواشی

(۱) خواجہ الطاف حسین حالی مسدس حالی کراچی: فضلی سنز ۱۹۹۹ء ص ۱۹۹

(۲) ظفر علی خان در روزنامہ زمیندار یکم جنوری ۱۹۱۰ء بحوالہ حکیم عنایت اللہ سوہدروی ظفر علی خان اور ان کا عہد لاہور: اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۲ء ص ۲۱

(۳) ظفر علی خان معرکہ مذہب و سائنس، لاہور: الفیصل ناشران ۱۹۹۵ء ص ۵

(۴) ظفر علی خان در پنجاب ریویو ستمبر ۱۹۱۰ء ص ۳۷ بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مولانا ظفر علی خان حیات خدمات آثار لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء ص ۲۹

(۵) دیگر ناموں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر، مولوی عزیز مرزا، خان بہادر مولوی سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج الہ آباد (یعنی اکبرالہ آبادی) مولوی عبدالحق، مولوی عبدالحلیم شرر، مولوی حمیدالدین صاحب بی۔اے، پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ پروفیسر نقاش فقیر اور نقاد وغیر شامل ہیں۔ ظفر علی خان: دکن ریویو اسلام نمبر ستمبر ۱۹۰۷ء جلد اول نمبر ۱۱،۱۲ صفحہ ''ہ''

(۶) دکن ریویو اسلام نمبر محولہ بالا، جائے مذکور

(۷) چندہم عصر کراچی: انجمن ترقی اردو ۲۰۱۰ء ص ۱۳۸، ۱۳۹
(۸) ظفرعلی خان ایڈیٹوریل (بہ سلسلہ موازنہ انیس و دبیر اور ردّالموازنہ) دکن ریویو اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ج تا ح در شبلی معاصرین کی نظر میں مرتبہ: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی لکھنو؛ اترپردیش اردو اکادمی ۲۰۰۵ء ص ۲۶۷
(۹) دکن ریویو سلسلہ جدید جلد سوم نمبر ۴ فروری ۱۹۰۹ء ص ۲۹-۴۲
(۱۰) ظفرعلی خان ایڈیٹوریل دکن ریویو سلسلہ جدید مارچ اپریل ۱۹۰۸ء ایڈیٹوریل صفحات الف تا دال
(۱۱) عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی باقیات اقبال لاہور: آئینہ ادب ۱۹۶۶ء ص ۲۴۵
(۱۲) یہ جسٹس محمود کا قول ہے دیکھیے: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی (مرتب) مکتوبات سرسید لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۶ء جلد اول ص ۴۶
(۱۳) ظفرعلی خان پیغامِ عمل (خطبہ لاہور کانفرنس) جنوری ۱۹۲۰ء بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۶۴۹
(۱۴) ظفرعلی خان نازلی بیگم اور دوسرے دلچسپ افسانے لاہور: عالمگیر بک ڈپو س۔ن ص ۱۲۱
(۱۵) ایضاً ص ۱۲۱
(۱۶) محمد تقی مدرس رضوی دیوان انوری تہران: شرکت انتشارات علمی و فرہنگی ۱۳۷۲ھ ش جلد دوم مقطعات، غزلیات، رباعیات ص ۷۵۱

مولانا جامی نے اپنی نگارستان میں کہا ہے:

در شعر سہ تن پیمبرانند   ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

(دیوان انوری کے فاضل مرتب نے تیسرے مصرعے میں ''ابیات'' کی جگہ ''اوصاف'' درج کیا ہے۔ص ۱۳)

(۱۷) نظم فتح مبین در چمنستان لاہور: پبلشرز یونائیٹڈ ۱۹۴۴ء ص ۲۶۴ چمنستان کی جدید اشاعت الگ کتابی صورت میں بھی طبع کی گئی ہے اور کلیات مولانا ظفرعلی خان کے ایک جزو کے طور پر بھی۔ لیکن دونو صورتیں اصل میں ایک ہی ہیں اور باقی کلیات کی طرح یہ اشاعت جہاں مغلوط ہے وہاں اس میں نظموں کے وہ نمبر بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں جو مولانا ظفرعلی خان نے قائم کیے تھے۔ مولانا ظفرعلی خان کے مرتب کردہ نسخے میں اس نظم کا شمار ۲۱۶ ہے جب کہ جدید اشاعت کے ناشرین نے اسے ۲۰۵ کر دیا ہے۔ کتاب کا نام کلیات ظفرعلی خان ہے اور اس میں صفحات کے نمبر الگ الگ کتابوں کے ہیں مسلسل صفحہ نمبر سرے سے موجود ہی نہیں (چمنستان مشمولہ کلیات ظفرعلی خان لاہور: مولانا ظفرعلی خان ٹرسٹ ۲۰۱۰ء ص ۱۸۱) یہاں خوانندگان کرام کے مطالعے کے لیے پوری نظم پیش کی جارہی ہے:

فتحِ مبین

اگر بدلا ہوا رنگ آسماں کا اور زمیں کا ہے
تصرّف اس تغیر میں مرے ذوقِ یقیں کا ہے

مُوحّد ہوں مجھے نسبت ہے ابراہیمؑ آزر سے
سبق جس نے پڑھایا لا اُحبُّ الآ فلیں کا ہے

وہ سجدہ ربّ اکبر کو پسند آئی ادا جس کی
ازل کی صبح سے پروردہ میری ہی جبیں کا ہے

نئی تہذیب اس نکتہ کو سمجھی ہے نہ سمجھے گی
کہ دنیا کو ہے جس کی احتیاج، اقرار دیں کا ہے

ضمانت کون دے سکتا ہے اُس کی پائداری کی
مکاں میں جب کہیں کی اینٹ ہے، روڑا کہیں کا ہے

کبھی دیکھا بھی ہے نقشہ مسلماں کی حویلی کا
زمیں جس کا ہے آنگن اور چھت عرشِ بریں کا ہے

عدو کی چیرہ دستی سے ہراساں ہو نہیں سکتے
مسلمانوں کے سر پر سایہ ربّ العالمیں کا ہے

ہر اِک فرعونِ بے ساماں کی گردن کو جھکا دے گی
وہ مِلّت قُرعہ جس کے نام پر فتحِ مبیں کا ہے

مرے اشعارِ جاں پرور ہیں اِک گلشن معانی کا
جو بُو اِن میں ہے حالی کی تو رنگ اِن میں حزیں کا ہے

لاہور: ۶ / دسمبر ۱۹۴۰ء

(۱۸) مولانا شیخ محمد علی حزین کلیات حزین لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور ۱۲۹۳ھ ص ۴۵۴

(۱۹) دکتر محمد رضا شفیعی کدکنی شاعری درہجوم منتقدان نقد ادبی در سبک ہندی ۔ پیرامون شعر حزین لاہیجی تہران: موسسہ انتشارات آگاہ ۱۳۷۵ھ ش ص ۸۰

(۲۰) جائے مذکور

(۲۱) دکتر سید محمد اکرام (مرتب) تنبیہہ الغافلین تالیف سراج الدین علی خان آرزو لاہور: دانشگاہ پنجاب ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء ص ۲۵

(۲۲) کلیات حزین محولہ بالا ص ۵۲۸

(۲۳) کلیات حزین ص ۴۹۲

(۲۴) کلیات حزین ص ۳۷۱

(۲۵) نظم سکندری در چمنستان محولہ بالا ص ۲۰۰

(۲۶) میرزا اسداللہ خان غالب غزلیات فارسی بہ تصحیح و تحقیق سید وزیر الحسن عابدی، لاہور: مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء ص ۳۵۸

(۲۷) نظیری نیشابوری دیوان نظیری نیشابوری تصحیح و تعلیقات محمد رضا طاہری تہران: موسسہ انتشارات نگاہ ۱۳۸۹ھ ش، ص ۱۱

(۲۸) دیوان نظیری نیشابوری ص ۲۳۱

(۲۹) دیوان نظیری نیشابوری کے محولہ بالا نسخے میں مصرع ثانی میں ''منبر'' کی جگہ'' مسند''درج ہے(ص۲۴۲) لیکن ہم نے اس کی معروف قرأت کے مطابق'' منبر'' کوترجیح دی ہے۔

(۳۰) دیوان نظیری نیشابوری ص۴۵

(۳۱) بملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را ''کسی کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست'' اقبال پیام مشرق لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۳ء ص۱۵۹

(۳۲) ہمارے پیش نظر کلیات صائب تبریزی کا جونسخہ ہے اس پر لکھا ہے : از روی نسخہ خطی کہ خود شاعر تصحیح نمودہ است مقدمہ وشرح حال بقلم استاد امیری فیروزکوہی (تہران: انتشارات خیام ۱۳۷۳ھ ش) لیکن اس میں ہمیں یہ غزل نہیں ملی، البتہ انٹرنیٹ پر دیوان صائب میں یہ غزل شمار ۸۱۲ پرموجود ہے http://ganjoor.net/saeb/divan-saeb/ghazalkasa/sh812/۔

(۳۳) شبلی نعمانی شعرالعجم ، لاہور: ملک نذیراحمد تاج بک ڈپو حصہ سوم س۔ن ص۹۷

(۳۴) Both he and Zafar Ali Khan were born journalists and brilliant masters of that frothy oratory that appeals to an Indian audience.(Page 175)

O'Dwyer, Sir Michael *India as I knew it* 1885-1925 London Constable & Company Ltd. 1925.

(۳۵) دیوان انوری محولہ بالا

(۳۶) مکاتیب ظفرعلی خان لاہور: سنی پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء ص۳۱۹

(۳۷) بہارستان لاہور: اردو اکیڈیمی پنجاب ۱۹۳۷ء ص۶۲۱

(۳۸) کلیات نظم حالی مرتبہ ڈاکٹر افتخار حسین صدیقی لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۸ء جلد اوّل ص۱۶۰

(۳۹) ایضاً ص۱۶۰، ۱۶۱

(۴۰) بہارستان محولہ بالا، جائے مذکور

(۴۱) کلیات نظم حالی محولہ بالا، غزل بر شمار ۵۵ ص۱۳۴

(۴۲) ظفرعلی خان نگارستان لاہور: پبلشرز یونائیٹڈ س۔ن ص۴۵۔۴۶

(۴۳) نظم ملاحظہ ہو:

اے عزیزو! مجھے پیغام یہ دینا ہے تمھیں — عربی مدرسہ کی شان کے شایاں نکلو
ہو چکو علم کی تحصیل سے جب تم فارغ — کچھ بھی بن جاؤ مگر بن کے مسلماں نکلو
باندھنا ہے تمھیں بکھرا ہوا شیرازۂ قوم — اپنے اللہ سے باندھے ہوئے پیماں نکلو
باندھ لو سر سے کفن ہاتھ میں لو پرچمِ حق — لے کے بطحا کا پرانا سر و ساماں نکلو
دل میں ہو ذوقِ یقیں سر میں ہو دیں کا سودا — مشکلیں قوم کی کرتے ہوئے آساں نکلو

راہ میں سیلِ حوادث سے گزرنا ہو گا ساق بر پا زدہ اور بر زدہ داماں نکلو
اپنے نیزے کے لیے چھین لو سورج کی کرن فلکِ پیر کو کرتے ہوئے حیراں نکلو
پیشوائی کو نکل آئے گی دنیا ساری گھر سے نکلو تو برنگِ شہِ مرداں نکلو
دل کے ارمان نکلنے کی یہی شکل ہے ایک
کہ جہانگیر و جہاں بخش و جہانباں نکلو

چمنستان محولہ بالا شمار نظم ۱۶۶ ص ۲۰۸

(۴۴) قارئین کی ضیافت طبع کے لیے یہ نظم بھی پیش خدمت ہے:

رحمتِ باری کم اپنا جوش کر سکتی نہیں یہ چڑھی ندی قیامت تک اُتر سکتی نہیں
زندۂ جاوید ہے اللہ والوں کا گروہ اُمّتِ مرحوم سو سکتی ہے مر سکتی نہیں
سرورِؐ کونین خود ہوں ناخدا جس کے وہ ناؤ لطمہء طوفانِ موج افزا سے ڈر سکتی نہیں
ایشیا کی وہ بساطِ کہنہ اُلٹی جا چکی بازیٔ اسلام اب دنیا میں ہر سکتی نہیں
میں نے یہ مانا کہ جس پر ہو عتاب انگریز کا اُس کی دنیا ہند میں رہ کر سنور سکتی نہیں
ٹوٹ لے جب تک نہ سر پر اک نیا کوہِ ستم ایک بھی رات اُس ستم کش کی گزر سکتی نہیں
ہو اِن ایذاؤں پہ لیکن شیوہ جس کا صبر و شکر عاقبت بھی کیا اُس انساں کی سُدھر سکتی نہیں
میری حرصِ لذّتِ آزار کا عالم نہ پوچھ سر نہ جب تک جائے نیت میری بھر سکتی نہیں
منزلِ خوفِ خدا ہے مومنِ قانت کا دل ہیبتِ قیدِ فرنگ اس میں اُتر سکتی نہیں
جرم اتنا ہے کہ کیوں حد ادب سے بڑھ کے آہ لب تک آجاتی ہے اور دل میں ٹھہر سکتی نہیں
رات ہی ایسی تھی جس کا بھول جانا ہے محال بات ہی ایسی ہے جو دل سے بسر سکتی نہیں
کفر سے مجھ کو ہے لاگ اور دیں سے ہے مجھ کو لگاؤ کوئی اور الزام دنیا مجھ پہ دھر سکتی نہیں
پانچ سیپاروں کی دولت ہے میرے سینہ میں جمع جس کو انگریزی حکومت قرق کر سکتی نہیں
میں حرم سے اُڑ کے جا بیٹھوں گا شاخِ سدرہ پر میرے پر تثلیث کی قینچی کتر سکتی نہیں

(ظفر علی خان حبسیات لاہور: منصور اسٹیم پریس ۱۹۲۶ء ص ۱۴۲۔۱۴۳)

(۴۵) ظفر علی خان بہارستان لاہور: مکتبہ کارواں س۔ن ص ۵۶۱
(۴۶) دیکھیے بانگ درا مشمولہ کلیات اقبال لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۵ء ص ۸۹
(۴۷) مسرت طاہرہ نے اپنے مقالے حالی کی مکتوب نگاری میں لکھا ہے ’’ظفر علی خان کو ابتدا سے ہی شعر و سخن کا شوق تھا آپ اپنی نظمیں اصلاح کے لیے مولانا حالی کے پاس بھیجا کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ

نے نظم رودِ موسیٰ پر لکھی اور اصلاح کے لیے مولانا حالی کو بھیجی ....'' اس کے بعد ظفر علی خان کے نام مولانا حالی کا ایک خط نقل کر کے (یہ خط زیر نظر مضمون میں شامل ہے) لکھا ہے ''اس قسم کے خط لکھ کر مولانا حالی اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے'' حالی کی مکتوب نگاری غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اردو زیر نگرانی ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور: شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج ۱۹۷۳ء ص ۵۴ ۔۵۵

(۴۸) شورش کاشمیری ظفر علی خان لاہور: مکتبہ چٹان ۱۹۵۷ء ص ۴۲، ۴۳

(۴۹) شمارہ مذکورہ صفحہ ''س'' از مولوی اصغر حسین صاحب جونپور

(۵۰) افسانہ مع دکن ریویو اگست ۱۹۰۴ء جلد دوم نمبر ۸ ماہ اگست ۱۹۰۴ء ص ۹

(۵۱) حالی نے یہ غزل داغ کی ایک غزل سے متاثر ہو کر کہی تھی جس کا مطلع ہے ؎

کب تک کھنچے رہو گے کب تک تنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

متاثر تو اس غزل سے ہوئے تھے لیکن جب فکر سخن کرنے لگے تو بحر یاد نہ رہی لاچار اسی بحر میں غزل پوری کی۔ یہ بات حالی نے اپنے ایک مکتوب بنام مولوی عبدالرحیم خان بیدل میں لکھی ہے جس کے ساتھ منسلک کر کے انھیں یہ غزل بھجوائی ہے یادگار حالی کی مصنفہ نے یہ غزل اور مکتوب نقل کر کے مطلع پر حاشیے کا نشان لگا کر لکھا ہے ''یونیورسٹی بل کی طرف اشارہ ہے'' صالحہ عابد حسین یادگار حالی لاہور: بک ٹاک ۲۰۰۷ء ص ۲۵۴

(۵۲) مخزن لاہور زیر ادارت عبدالقادر جلد ۱۹ نمبر ۶ ستمبر ۱۹۱۰ء ص ۴۳

(۵۳) یہ نظم ''فریادِ ظفر اور شورِ محشر'' کے ناموں سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اب اس کے متن کے لیے دیکھیے غلام حسین ذوالفقار ظفر علی خان ادیب و شاعر لاہور: مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۷ء صص ۳۳۵۔۳۴۲

(۵۴) ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی محمد اکبر خان انتقال کر گئے تھے، (م: ۱۳۲۳ھ) ان کی یاد میں ظفر علی خان کا مرثیہ دکن ریویو میں شائع ہوا اور اب بہارستان کے اس نسخے میں دیکھا جا سکتا ہے جو اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی صاحب نے مرتب کیا تھا (لاہور: مکتبہ کاررواں س ن صص ۵۶۲۔۵۶۳)

(۵۵) مشہور شاعر اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء......یکم نومبر ۱۹۱۷ء) مراد ہیں۔

(۵۶) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مکاتیب حالی کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۰ء ص ۶۱۔۶۲

(۵۷) ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی کتاب *A History of the Conflict between Religion and Science* کا اُردو ترجمہ جو حیدرآباد دکن سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ جدید اشاعت کے لیے دیکھیے: ظفر علی خان معرکۂ مذہب و سائنس لاہور: الفیصل ناشران ۱۹۹۵ء

(۵۸) معرکہ مذہب و سائنس کا مقدمہ مراد ہے جو مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے۔
(۵۹) ظفرعلی خان کا رسالہ پنجاب ریویو جو انھوں نے حیدرآباد دکن سے پنجاب آجانے پر ۱۹۱۰ء میں کرم آباد سے جاری کیا۔اس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔
(۶۰) پروفیسر حمید احمد خان صاحب کے مطابق اس سے مولانا ظفرعلی خان کا مضمون ''اسلام کی دنیوی برکتیں'' مراد ہے جو پنجاب ریویو کے پہلے پرچے میں شائع ہوا(ارمغان حالی لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۰۱۰ء ص ۱۴۳)
(۶۱) محولہ بالا مضمون کے آخر میں درج مولانا ظفرعلی خان کی مشہور نعت کی طرف اشارہ ہے:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں ‫ اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو ‫ یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں ،یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا ‫ وہ رازاک کملی والے نے بتلادیا چنداشاروں میں
وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے ‫ ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو قرآن کے یہ سیپاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یاران نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

(ظفرعلی خان خمستان حجاز لاہور: کتب خانہ مقبول عام ۱۹۶۸ء ص ۵
(۶۲) مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ء............۱۸۹۵ء)
(۶۳) مکاتیب حالی محولہ بالا ص ۶۳۔۶۵
(۶۴) زاہد منیر عامر ظفر علی خان خطوط و خیوط لاہور: مسندِ ظفرعلی خان ،ادارہ علوم ابلاغیات ،پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۲ء صفحہ ۳۷ تا ۱۷ پر یہ خط موجود ہے۔صفحہ ۲۱ تا ۳۶ اس خط کی تمہید اور صفحہ ۲۷تا ۸۶ اس خط کے حواشی ہیں۔
(۶۵) غالباً مولانا ظفرعلی خان کی کتاب جنگ روس و جاپان پر ریویو کا ذکر ہے جو ایک ڈرامے کی صورت میں لکھی گئی اور پہلی بار حیدرآباد سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔میر محفوظ علی بدایونی کے صاحبزادے سید ابن علی بدایونی نے لکھا ہے کہ ''جنگ روس و جاپان والا ترجمہ انھوں نے وہیں (بربرہ میں) مکمل کیا'' (طنزیات و مقالات ص ۳۵) جنگ روس و جاپان پر اس کا ترجمہ ہونا مذکور نہیں ، دوسرے اس کی تصنیف بربرہ میں نہیں بلکہ وہاں جانے سے پہلے حیدرآباد دکن میں ہو چکی تھی اور یہ ڈرامہ ۱۹۰۵ء میں دکن ریویو کی تیسری جلد کے شمارہ ۹۔۱۱ میں شائع بھی ہو چکا تھا۔اس کے بعد ۱۹۰۵ء ہی میں کتابی صورت میں بھی چھپ گیا تھا، نیز اس کے سرورق پر بھی یہ صراحت موجود ہے'' مصنف ممدوح نے ایامِ قیامِ حیدرآباد میں تصنیف فرمایا'' (ر۔ک طبع ثانی اسلامیہ سٹیم پریس لاہور ۱۹۱۴ء)
(۶۶) پیسہ اخبار برعظیم کا مشہور اخبار جسے منشی محبوب عالم نے ۱۸۸۷ء میں فیروز والا سے جاری کیا ، آٹھ

صفحوں کا یہ سنجیدہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا پھر ہفتے میں تین دن نکلنے لگا بعدازاں روزنامہ ہوگیا۔ منشی محبوب عالم اس سے پہلے ۱۸۸۶ء میں ایک ماہانہ رسالہ زمیندار جاری کر چکے تھے جن کے مقاصد وہی تھے جواجرائے زمیندار کے وقت مولانا ظفرعلی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد کے پیشِ نظر تھے۔

پیسہ اخبار فیروزوالا سے لاہور منتقل ہوا، انیسویں صدی کے اواخر تک روزنامہ بن گیا، مولانا ظفرعلی خان کے زمیندار کی عنانِ ادارت سنبھالنے تک اردوصحافت پر پیسہ اخبار کی حکمرانی رہی۔

(۶۷) وطن کے ایڈیٹر مولوی ان شاء اللہ خان ایک مشہور مصنف اور صحافی تھے، وطن کے اجرا سے قبل وہ کئی برس وکیل کی ادارت کر چکے تھے چنانچہ ۱۹۰۲ء میں جب اپنے اخبار وطن کا اجرا کیا تو اسے وکیل ہی کے انداز میں چلایا لیکن بعدازاں پھر ضرورتِ زمانہ کے تحت اخبار کی روش تبدیل کر لی اور ایک زمانے میں وطن کی اشاعت چار ہزار تک پہنچ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں اسے روزانہ کر دیا گیا، ۱۹۳۵ء میں اس کا سلسلہء اشاعت موقوف ہوگیا۔

(۶۸) یہ ہفت روزہ اخبار تھا، انیسویں صدی کے آخر میں امرتسر سے جاری ہوا، اس کے مدیر شیخ غلام محمد (م:۱۹۱۲ء) تھے ابتدا میں ہفت روزہ تھا لیکن بعدازاں سہ روزہ ہوگیا، اس اخبار سے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبداللہ عمادی جیسے لوگ بھی منسلک رہے، بہ قول مولانا محمد علی جوہر''وکیل اردوصحافت کا بہترین نمونہ'' تھا اور'' اس کے خیالات ہمیشہ دانش مندانہ اور پروقار رہے اور یہ ذہنی رواداری کا مظہر تھا''

(۶۹) مکتوب حالی بنام عبدالحق در مکتوبات حالی مرتبہ خواجہ سجاد حسین پانی پت: حالی پریس ۱۹۲۵ء جلد اوّل ص ۶۵، ۶۶

(۷۰) مکتوب نمبر ۵۳ بنام عبدالحق محولہ بالا ص ۶۶

(۷۱) مکتوبات حالی محولہ بالا ص ۶۷ شیخ محمد اسمعیل پانی پتی کلیات نثرحالی لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۷ء جلد اول ص ۴۹۶

(۷۲) مکتوبات حالی جائے مذکور

(۷۳) مکتوبات حالی اول ص ۶۶ جن اندراجات پر ☆ بنایا گیا ہے وہ عبدالحق کی نقل سے غائب ہیں۔

(۷۴) عبدالحق مقدمہ مکتوبات حالی محولہ بالا جلد اوّل ص ۱۲

(۷۵) کلیات نثر حالی جلد اوّل ص ۴۹۴

(۷۶) وجاہت حسین جھنجھانوی زمیندار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے

(۷۷) شیخ محمد اسمعیل پانی پتی تذکرۂ حالی پانی پت ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۳۳

(۷۸) مکاتیب حالی محولہ بالا

(۷۹) ظفرعلی خان بی اے ایڈیٹر دکن ریویو جلد دوم نمبر ۶، ۷ جون جولائی ۱۹۰۴ء ص ۲۹، ۳۰

(۸۰) ڈاکٹر صادق حسین طور''مولانا ظفر علی خان'' ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور مارچ ۱۹۶۷ء ص ۸۸

(۸۱) بحوالہ مولانا ظفر علی خان۔ حیات خدمات و آثار محولہ بالا ص ۱۱۲

(۸۲) روزنامہ زمیندار لاہور ۴/مئی ۱۹۲۸ء

مولانا ظفر علی خان نے اپنے اس مضمون میں علامہ عبداللہ العمادی کے تہنیتی اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن کا اعادہ بہ قول مولانا ظفر علی خان ''ایک ادبی تحفہ کے طور پر خالی از لطف نہ ہوگا'':

ای کہ از روم اناطولیہ بازآمدہ ای — فرصت باد کہ اسلام نوازآمدہ ای
برزبان نعرۂ توحید و بسر رایت حق — چشم بددور کہ بافرہ و ساز آمدہ ای
آب و رنگی زتو دین نبوی خواہدیافت — ای کہ تثلیث کشِ کفر گداز آمدہ ای
بعدازین رازخلافت نشود یادہ بہند — کہ تو در ہند زخلوت گہ راز آمدہ ای
نازپلتیک فرنگ ازتوگرہ بکشاید — ''کہ بہ ہر حال باندازۂ ناز آمدہ ای
بوکہ درراہبریت لطف ازل بدرقہ باد — کہ نوازندۂ ارباب نیاز آمدہ ای

بغلط می رود این طائفہ راہش بنمای
توکہ باخبرت آن طائفہ باز آمدہ ای

(۸۳) ارمغان حالی محولہ بالا ص ۲۵۹

(۸۴) بہارستان محولہ بالا

(۸۵) مطبوعہ بازیافت تحقیقی مجلّہ شعبہ اردو، لاہور: شعبہ اردو، اورینٹل کالج شبلی نمبر مدیر ڈاکٹر محمد کامران، جولائی دسمبر ۲۰۱۵ء شمارہ ۲۷ ص ص ۱۱۳۔۱۳۵

(۸۶) روزنامہ زمیندار لاہور جلد ۵ نمبر ۲ لاہور یوم یکشنبہ ۱۶/صفر المظفر ۱۳۳۳ف مصادف ۲۰/ پوہ سمت ۱۹۷۱ بکرمی مطابق ۳/جنوری ۱۹۱۵ء موافق یکم اسفندار ۱۳۲۴ ص ۹

(۸۷) روزنامہ زمیندار جلد ۵ نمبر ۴ لاہور یوم سہ شنبہ ۱۸ صفر المظفر ۱۳۳۳ھ مصادف ۲۲ سمت ۱۹۷۱ بکرمی مطابق ۲۵ جنوری ۱۹۱۵ء موافق ۳/اسفند ۱۳۳۴ ص ۴

(۸۸) روزنامہ زمیندار لاہور جلد ۵ نمبر ۵ لاہور یوم چہارشنبہ ۱۹/صفر المظفر ۱۳۳۳ھ مصادف ۲۳ پوہ سمت ۱۹۷۱ء بکرمی مطابق ۶/جنوری ۱۹۱۵ء موافق ۴/اسفند ۱۳۲۴ ص ۴